ISSN 0974-7346

نومبر ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۱۱

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ ؍روپے۔ فی شمارہ ۳۰ ؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۵۵ ؍روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ ؍روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ ؍روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ ؍روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۳ء | عدد ۱۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

۸ ؍اکتوبر کے اخباروں اور جدید و قدیم تمام ذرائع اطلاعات کے ذریعے جیسے ساری دنیا میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ خبر آئی کہ غزہ کے فلسطینیوں کی ایک تنظیم حماس نے اچانک اسرائیل کے آسمانوں ہی سے اسی کی سرزمین پر بموں اور میزائیلوں کی بارش کردی، نتیجہ میں سینکڑوں اسرائیلی فوجی و شہری اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ خبر یقیناً غیر متوقع تھی لیکن ان لوگوں کے لیے جن کا پیشہ ہی موت کی سوداگری ہے اور جن کی وجہ سے ہر روز ساری دنیا میں بے گناہ انسانوں کے قتل عام کی خبریں عام ہیں اور جن کی سیاست کا تخت ہی لہو کے سمندر پر تیرتا ہے، ان سے اس چیخ پکار اور شور و شرابہ کی توقع بھی ایسی نہ تھی۔ اس کے بعد جو ہوا وہ اب قریب ہفتہ عشرہ گزرنے کے بعد وحشیانہ فوجی انتقام کے ساتھ مکر و فریب اور جھوٹ اور دروغ بافی کی وہ مثال ہے جس پر انسانیت شاید ہمیشہ شرمسار رہے۔ اسرائیل اور اس کے جرائم میں شریک ملکوں اور قوموں نے جھوٹ اور غلط بیانی کو جس طرح اپنا حربہ بنایا اور سوشل میڈیا کے ذریعہ جس منظم طریقے سے مظلوم کو ظالم بنانے اور بتانے کی مہم چلائی گئی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ حق یہ ہے کہ دنیا کی جنگوں میں اتنے بم نہیں گرائے گئے ہوں گے جتنا ان اخبارات واطلاعات کے ذریعہ شعلہ باری کی گئی۔ اس سلسلہ میں فلسطین کے تعلق سے تاریخ قدیم، مذہب، سیاست، معیشت، جیسے موضوعات بھی ہر اس شخص کے مبلغ علم کا ذریعہ اظہار بن گئے جس کو خود اپنے حدود قلم کی خبر نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلم کا زیادہ وقت ان موشگافیوں کی نذر ہو گیا کہ حماس کا یہ عمل شجاعت اور غیرت اور مردانگی کا ثبوت ہے یا پھر یہ مصلحت اور وقت کی نزاکت سے بے خبری اور اپنی عافیت کی دشمنی کا نمونہ ہے۔ عالمی سوشل میڈیا نے جھوٹ بولنے اور پھیلانے میں خود کو جس طرح کریمنل میڈیا میں بدل دیا اس نے پہلی بار دجال اور دجالیت کے مشکل معانی کی تفہیم بھی آسان کردی۔

***

فلسطین، یورپ اور اسرائیل، اس تثلیث کی حقیقت دیکھا جائے تو پہلی بار سامنے نہیں آئی۔ اس کے جائزے کے لیے ایک الگ مطالعہ کی ضرورت ہے، یہاں تو یہ کہنا ہے کہ وضع کردہ خبروں پر منحصر موجودہ میڈیائی دنیا کیا واقعی اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ پچھتر سال سے شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جو قلیل تعداد کے فلسطینیوں پر ہر قسم کی اذیتوں سے خالی رہا ہو۔ جہاں مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور قبہ صخرہ کو نیست و نابود کرنے کی حرکت، فلسطینی مسلمانوں کی قدیم بستیوں کو اجاڑنے اور بے گناہ نوجوانوں اور بچوں کے قتل بلکہ قومی نسل کشی کی خبریں نہ آتی ہوں لیکن چند آوازوں کے سوا پوری دنیا میں ان

مسلسل صہیونی مظالم پر کبھی ماتم ہوا نہ مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہونے کا اظہار ہوا، نہ ان کی پیشانی پر کوئی بل آیا جنھوں نے سارے انسانوں کے حقوق کی وکالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ نسلوں پر نسلیں گزرتی گئیں لیکن ان کے دکھ درد سے اپنے پرائے سب گریزاں ہی نظر آئے۔ فلسطین کی زمین تو اپنی جگہ رہی لیکن فلسطینیوں کے لیے وہ تنگ ہوتی گئی۔ اس تنگی میں فراوانی تھی تو صرف ظلم، استبداد اور استحصال کی۔ کبھی کوئی باضمیر سیاح ان سمٹتی آبادیوں سے گزرتا تو یہ دیکھ کر خون کے آنسو روتا کہ انبیائے کرام کی وہ بستی جہاں کبھی لاکھوں کی تعداد میں فلسطینی تھے اب وہ صرف چار ہزار یہودیوں کے لیے خاص ہو گئی اور ان یہودیوں کی حفاظت کے لیے دو ہزار اسرائیلی فوجی تعینات کیے گئے۔ یعنی چھ ہزار کے لیے لاکھوں کو کچل دیا گیا۔ یہ حیبرون (الخلیل) کا ذکر ہے۔ سیاح کے الفاظ میں ناقابل یقین کیا نا قابل تصور ظلم ہے۔ فلسطینیوں کو جہاں رکھا گیا وہ ایسے کیمپ بن گئے جہاں کسی کو ذاتی گاڑی رکھنے کی اجازت نہیں، چاروں طرف کرنٹ دوڑاتے ہوئے بجلی کے تار، بے روک ٹوک نہ اپنے رشتہ داروں کے پاس جا سکتے ہیں نہ کھیتوں کو، بستی کی بستی ایک جیل یا زندہ لاشوں کا قبرستان، بھیک مانگتے ہوئے نبیوں کی اولاد، دیکھنے والے کا جگر شق کر دینے والے یہ مناظر چند برس پہلے کے ہیں، لیکن لہو پی کر مساوات اور انسانیت کا درس دینے والوں اور موت کے سوداگروں کے لیے یہ بے بس اور اپنے ہی وطن میں قیدی فلسطینی بس دہشت گرد اور انتہا پسند ہی تھے۔ قومیت اور قوم پرستی کے پردے میں صرف یہود ہی نہیں اور بھی صہیونی طبل نوازوں نے پہلے بھی اور آج بھی جارحیت اور غاصبیت کے ساتھ کھڑے ہونے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی۔

***

اگست ۱۹۴۵ء میں جب اسرائیل کا ریاستی وجود ظاہر نہیں ہوا تھا، اس وقت معارف نے کہا تھا کہ یورپ صرف قوت کے دیوتا کا پجاری ہے۔ خواہ یہ جنگی ہو یا مالی، اس لیے عدل و انصاف اور رحم و ترحم اور سوال و دریوزہ گری کے نام سے اس سے کسی قوم کو کچھ نہیں مل سکتا۔ یہ جملے انگلینڈ میں اس وقت قدامت پرستوں کی شکست اور زیادہ کھلے دماغ کی حامل کہی جانے والی لیبر پارٹی کی فتح کے موقع پر لکھے گئے۔ اس فتح میں یہودی سود خواروں کی دولت نے اپنا اثر دکھایا تھا۔ سید صاحب نے تب لکھا تھا کہ یہود جو کبھی ذلیل تھے اور کسی سیاست میں اعتناء کے لائق نہ تھے، انھوں نے اپنی دولت کے ذریعہ لیبر پارٹی سے فلسطین میں آزاد یہودی ریاست کی تائید حاصل کر لی۔ یہ یہودی ریاست بظاہر یہودیوں کے لیے تھی لیکن اس کے پس پشت انگریزوں کی شہنشاہی کی حفاظت تھی کہ اگر نہر سوئز پر مصر کا اختیار ہو گیا تو

دوسری جانب فلسطین ہے جہاں ایسے باشندوں کی قوم بطور پہرے دار رکھی جائے جو اپنے وجود کے لیے ہر وقت انگریز مسیحیوں کی محتاج رہے۔ یہودی آبادی اور یہودی ریاست کے یہی معنی ہیں۔

***

یہودی یا اسرائیلی طاقت سے آج جو مرعوب و مبہوت ہیں یا جن کو ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کا مطلب سمجھنا ذرا دشوار ہے ان کے لیے ۱۹۴۵ء کی سید صاحب کی بات بار بار غور کرنے کے لائق ہے۔ اسی طرح غزہ نے جو کیا اس کو عزیمت اور غیرت و حمیت کی بس وہ کرن سمجھنے کی ضرورت ہے جو عالمی استعماریوں اور صہیونیوں کا شکار دنیا کے بے شمار مجبوروں اور مظلوموں کے لیے امید کی روشنی بن گئی ہے۔ غزہ کی اس روشنی کو عرب، ایران، علاقائیت اور مسلکیت جیسی بحثوں سے خود کو اندھیروں میں ڈھکیلنے کی ضرورت نہیں۔ غزہ نے تو یہ یاد دلایا کہ وہ غزہ ہاشم یوں ہی نہیں، نبی کریم ﷺ کے جد امجد کی آخری آرام گاہ کی نسبت بے اثر نہیں ہو سکتی۔ غزہ تو امام شافعی کی وہ بستی ہے جس کے لیے امام صاحب نے دعا کی تھی کہ اس وطن کی شادابی سلامت رہے اور اس کی خاک کو سرمہ بننے کی تاثیر ملے۔

غزہ کے شہیدوں اور غازیوں نے بتایا کہ ملت عربی کی تب و تاب کا راز ازل سے کشاکش پیہم میں ہے، جب جب یہ راز منکشف ہوگا تو دل سے دعا نکلے گی کہ:

زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے

غزہ نے اس پیغام کی بھی یاد دلا دی جس کی حقیقت سے صدیوں سے چشم پوشی کی جاتی رہی، یہ پیغام اس کے سوا اور کیا ہے کہ:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

امن، رواداری اور بقائے باہم کی نعمتوں کو اگر وقت کے فرعون برباد کرنے ہی پر آجائیں اور زبانی امن و سلامتی، عملاً زندگی ہی تنگ کر دے تو بجنگ آمد کو صرف بزدل، منافق اور بے حمیت ذہن ہی ناجائز کہہ سکتے ہیں۔

***

مقالات

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تصنیفی خدمات

ڈاکٹر محمد انس حسان

اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ملت گریجویٹ کالج، ممتاز آباد، ملتان

nskashmiri@gmail.com

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرح متعدد کتب تصنیف فرمائیں۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے آپ کی ۲۲ کتب کی نشاندہی کی ہے۔ جبکہ ۱۳ ایسے رسائل کی فہرست بھی پیش کی ہے جو شاہ صاحب سے غلط طور پر منسوب ہیں۔[1] حکیم محمود احمد برکاتی نے ۲۲ کتب و رسائل کی فہرست مرتب کی ہے۔[2] مولوی عبدالرحیم دہلوی نے ۹ کتب کا ذکر کیا ہے، جو ان کے نزدیک مطبوعہ ہیں جبکہ قلمی مسودات (غیر مطبوعہ) کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے۔[3] مولانا عبدالحی لکھنوی نے آپ کی کئی کتب کا ذکر کیا ہے۔[4] پروفیسر اقبال مجددی نے آپ کی ۳۳ کتب کی فہرست دی ہے۔[5] عبدالرشید عراقی نے

---

[1] فریدی، نسیم احمد، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۷۱۔۷۳/ فریدی صاحب نے اس فہرست میں تفسیر عزیزی کے اجزاء کو الگ شمار کیا ہے۔ اس بنا پر ان کی بیان کردہ تصانیف کی تعداد ۱۹ رہ جاتی ہے اور ان میں سے بھی دو غیر مطبوعہ ہیں۔

[2] برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵۲۔۱۵۳

[3] دہلوی، عبدالرحیم، حیات ولی، المکتبہ السلفیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۶۱۶۔۶۲۳

[4] لکھنوی، عبدالحی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۹۰۹ء، ج ۷، ص ۲۷۰

[5] مجددی، محمد اقبال، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (مقدمہ)، پروگریسیو بکس، ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۔۲۷

۱۸ا کتب کی فہرست پیش کی ہے۔[۶] ڈاکٹر ثریا ڈار نے آپ کی ۱۰۱ کتب کا ذکر کیا ہے۔[۷] یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی کتب کی تعداد میں محققین اختلاف کا شکار کیوں ہیں؟ تو اس کی درج ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں:

- شاہ صاحب کے بعض مکتوبات و فتاویٰ الگ رسائل کی شکل میں شائع ہوئے اور ان کی کتب میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بعض نے انہیں الگ تصور کیا اور بعض نے کتب کے تذکرے کے بعد ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
- بعض محققین کو جس قدر کتب مطبوعہ میسر آسکیں انہوں نے ان ہی کا ذکر کیا اور دیگر کتب ان کے عدم علم کے سبب احاطہ قلم میں نہ آسکیں۔
- بعض لوگوں نے شاہ صاحب سے بعض کتب کو غلط طور پر منسوب کیا اور بعد کے لوگوں نے اس پر تحقیق کیے بغیر وہ کتب شاہ صاحب ہی کی تصور کیں۔ محض کتب ہی نہیں بلکہ آپ کی بعض اہم کتب مثلاً تحفہ اثنا عشریہ میں تحریفات کا شکوہ تو خود شاہ صاحب نے کیا ہے۔
- خانوادہ ولی اللہی کی بعض کتب کے انتساب میں بعض اہل علم کو اشباہ ہوا ہے اور انہوں نے دیگر خانوادے کی کتب شاہ صاحب سے منسوب کر دی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی تصانیف کی اجمالی فہرست مستند قرائن کی روشنی میں پیش کر دی جائے۔

۱۔ فتح العزیز (فارسی): فتح العزیز المعروف، تفسیر عزیزی شاہ عبدالعزیز دہلوی کی وہ تفسیری کاوش ہے۔ جس کو انہوں نے اپنے آخری ایام میں جبکہ ان کی بینائی مکمل طور پر زائل ہو چکی تھی املاء کروائی تھی۔ مولانا عبدالحی سمیت متعدد محققین کی رائے ہے کہ یہ مکمل قرآن کریم کی تفسیر تھی جو بوجوہ ضائع ہو گئی۔[۸] مگر ہم تک جو اس کا حصہ پہنچا ہے وہ سورۃ فاتحہ تا پارہ سیقول ربع اول، سورہ مومنون تا سورہ یٰس

---

[۶] عراقی، عبدالرشید، خاندان ولی اللٰہی دہلوی کی تصنیفی خدمات، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۷۸۔۹۰

[۷] ڈار، ثریا، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۲۰۰۹ء، ص ۷۸۔۹۰

[۸] لکھنوی، عبدالحی، نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۲۷۳

اور آخری دو پاروں کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر شاہ صاحب کے قوت حافظہ، علمی تبحر اور قرآن فہمی کا عمدہ نمونہ ہے۔ مولوی عبدالرحیم دہلوی کے مطابق:

یہ تفسیر ایسے نرالے ڈھنگ میں لکھی گئی ہے جس کی نظیر سے تمام متقدمین ومتاخرین کے حلقے خالی ہیں۔ اس میں تمام علوم وفنون کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں اور ہر علم کا کافی نمونہ دکھایا گیا ہے۔ جس سے مولف کی شان علم اور علمی تبحر بہت کچھ ثابت ہوتا ہے۔[9]

تفسیر کے مقدمے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد شیخ مصدق الدین عبداللہ کی تحریک پر لکھی گئی اور انہی کو شاہ صاحب نے اس کا املاء کروایا تھا اور یہ سلسلہ ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء میں مکمل ہوا۔[10] یہ تفسیر شاہ صاحب کے انتقال کے آٹھ سال بعد ۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء میں پہلی مرتبہ کلکتہ سے طبع ہوئی۔ دوسری مرتبہ یہ تفسیر ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں کانپور سے طبع ہوئی۔ یہ طباعت دراصل تفسیر عزیزی کا پہلا اردو ترجمہ تھا جو مولانا محمد حسن خان شیدارام پوری نے کیا تھا۔ تیسری مرتبہ یہ تفسیر ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۸ء میں چوتھی مرتبہ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۸ء میں مطبع حیدری بمبئی، پانچویں مرتبہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۴ء اور چھٹی مرتبہ ۱۳۴۸ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے طبع ہوئی۔ بعدازاں اس کی متعدد اشاعتیں ہوئیں۔ اس تفسیر کا پہلا ترجمہ مولانا محمد حسن خان نے کیا تھا۔[11] جبکہ دوسرا ترجمہ مولانا محفوظ الحق قادری نے کیا۔[12] تفسیر عزیزی پارہ ۲۹ کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں ہے جس کے کل اوراق ۱۸۷ ہیں۔ اسی طرح دستیاب تفسیر کا ایک اور مکمل قلمی نسخہ بھی اسی کتب خانہ میں موجود ہے، جس کے ۴۶۴ اوراق ہیں۔ اسی کتب خانہ میں تفسیر عزیزی پارہ ۳۰ کے تین قلمی نسخے اوراق ۳۵۲ اور تفسیر سورۃ فاتحہ کا ایک قلمی نسخہ اوراق ۱۸ بھی ہیں جن کے کاتب سراج الدین اجمیری ہیں۔ اس کے علاوہ مدراس

---

[9] دہلوی، عبدالرحیم، حیات ولی، ص ۶۱۸

[10] دہلوی، شاہ عبدالعزیز، تفسیر فتح العزیز، مطبع حیدری، بمبئی، ۱۲۴۹ھ، ج ۱، ص ۳/ سورۃ مومنون تا سورۃ یٰس کا مطبوعہ نسخہ دراصل شاہ عبدالعزیز کے دوسرے شاگرد مولوی امام الدین کا املاء کردہ ہے۔ شیخ مصدق الدین کی بہ نسبت مولوی امام الدین کے املائی نسخہ میں اختصار ہے۔

[11] مولانا محمد حسن خان کا ترجمہ آخری دو پاروں پر مشتمل تھا۔ پہلے پارے کا ترجمہ مولوی محمد علی چاندپوری نے کیا تھا جسے مطبع مصطفائی نے ''بستان التفاسیر'' کے نام سے طبع کیا۔

[12] مولانا محفوظ الحق قادری کا ترجمہ مکتبہ نوریہ رضویہ نے پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ء میں ''جواہر عزیزی'' کے نام سے طبع کیا جبکہ اس کی دوسری اشاعت ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔

میں بھی اس تفسیر کے دو قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔[۱۳] اس تفسیر کا عربی زبان میں ''تفسیر العزیزی'' کے نام سے حافظ عبد القادر آلوی (م: ۱۲۵۱ھ) نے ترجمہ کیا ہے جو کتب خانہ باقیات صالحات (ویلور) میں موجود ہے۔[۱۴] شاہ صاحب کی اس تفسیر کا تکملہ آپ کے شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی (م: ۱۲۹۹ھ /۱۸۸۱ء) نے سکندر بیگم والیہ بھوپال کی خواہش پر کیا تھا جو ۷ ۲ جلدات پر مشتمل تھا۔ اس تکملہ کے چند اجزاء کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد۔ دکن میں موجود ہیں۔[۱۵]

۲۔ عجالۂ نافعہ (فارسی): شاہ عبد العزیز کا یہ رسالہ اصول حدیث سے متعلق ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے مصطلحات حدیث اور اس کی اقسام و روایت اور طبقات کتب احادیث کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ رسالہ دراصل شاہ صاحب نے اپنے شاگرد اور مشہور شاعر سید قمر الدین منت (م: ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۲ء)[۱۶] کی خواہش اور تحریک پر لکھا تھا۔ اس رسالہ کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ رسالہ جو کہ بہت مفید اور عمدہ ہے۔ علم حدیث کے فوائد کے متعلق ہے۔ اس کی وجہ تحریر برادر عالی سید قمر الدین حسینی کی خواہش ہے۔ خوش قسمتی سے ان دنوں ان کے دل میں علم حدیث سے اشتغال کا جذبہ غالب ہے اور یہی شوق ان کے ذہن میں راسخ ہے۔ اس ناچیز سے

---

[۱۳] فریدی، نسیم احمد، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، ص ۲۷

[۱۴] راہی فدائی، خانوادہ شاہ ولی اللہ اور علمائے جنوب کے علمی روابط، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، فروری ۲۰۱۷ء، ص ۱۰۵

[۱۵] عبد الرحیم ضیاء کے مطابق انہوں نے یہ تکملہ مکمل دیکھا ہے۔ بہت خوب لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو: مقالات طریقت، (تحقیق و تعلیق: محمد اقبال مجددی)، پروگریسو بکس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء کی وفات ۱۲۸۳ھ /۱۸۶۶ء تک یہ تکملہ مکمل حالت میں موجود تھا۔ لیکن بعد میں اس کا حال بھی تفسیر عزیزی جیسا ہوا اور اب اس کے چند اجزاء ہی ملتے ہیں۔

[۱۶] سید قمر الدین منت نے شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین سے علوم نقلیہ کی تعلیم پائی۔ حدیث کی تکمیل شاہ عبد العزیز سے کی تھی۔ روحانی تعلق شاہ فخر الدین دہلوی سے تھا۔ شاعری کا بہت اعلیٰ مذاق پایا تھا۔ ایک لاکھ پچاس ہزار اشعار کا ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ مولانا عبد الحی لکھنوی کے مطابق آخری عمر میں قدرے تشیع کی طرف میلان ہو گیا تھا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: لکھنوی، عبد الحی، نزہۃ الخواطر، ج ۷، ص ۳۹۰)

چونکہ ان کی افادہ واستفادہ کی محفلیں جمتی ہیں۔ لہٰذا حسن ظن کی بناپر انہوں نے مجھ سے یہ رسالہ لکھنے کو کہا اور میں نے ان کے فرمان کے مطابق لکھ دیا۔[۱۷]

اس رسالے کا شاہ صاحب نے کوئی نام تجویز نہیں کیا تھا۔ لیکن موصوف کے ان الفاظ ''ایں رسالہ ایست رائعہ و عجالہ ایست نافعہ'' سے یہ رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہ رسالہ پہلی مرتبہ شیخ سعدالدین ابن المفتی عبدالحکیم کی تصحیح سے ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں مطبع مصطفائی (لکھنؤ) سے متوسط تقطیع کے ۳۶ صفحات پر شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں یہ مطبع انصاری (دہلی) سے بھی طبع ہوا۔ ان دونوں میں مطبع مصطفائی (لکھنؤ) کے نسخے میں صحت کا بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ گو مصحح نے واضح نہیں کیا کہ اس کی تصحیح میں کون کون سے قلمی نسخے اس کے پیش نظر رہے اختصار اور جامعیت کی خصوصیت کے سبب یہ رسالہ پاکستان اور ہندوستان سے کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ اس رسالہ کا پہلا اردو ترجمہ طبع عزیزی المعروف مطبع احمدی سے ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں شاہ ولی اللہ کے چار رسائل کے ساتھ شائع ہوا۔ اس رسالہ کا دوسرا اردو ترجمہ اور شرح ''فوائد جامعہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی نے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں شائع کیا جو ۵۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے مطبع نور محمد (کراچی) نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب محمد حماد کریمی ندوی کی ترتیب و پیشکش سے مجلس ثقافت و نشریات اسلام (بہار) سے ۱۴۳۵ھ/۲۰۱۴ء میں بھی طبع ہو چکی ہے۔ اس رسالہ کا پہلا عربی ترجمہ "العلالة الناجعة" کے نام سے مولانا عبدالاحد قاسمی نے کیا جسے مکتبہ قرآن منزل (ڈھاکہ) نے ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ یہی عربی ترجمہ دوسری مرتبہ مولانا سلمان الحسینی ندوی کی تقدیم و مراجعت کے ساتھ المعھد العالی الدراسات الشرعیہ (لکھنؤ) سے ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا عربی ترجمہ مولانا عبدالرشید بن عبدالعزیز نے کیا جس کو مکتبۃ السعیدیہ (کراچی) نے ۱۳۹۵ھ/۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔

۳۔ بستان المحدثین (فارسی): شاہ عبدالعزیز کی یہ کتاب دراصل فن تاریخ کا ایک بہترین ذخیرہ ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں تمام کتب حدیث اور ان کے مصنفین و مولفین کے حالات شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں ۷۷ محدثین کرام اور ان کی کتب کا تعارف کرایا ہے۔ محمد محسن ترہتی لکھتے ہیں:

''منہا کتابہ البستان المحدثین جمع فیہ علوم الحدیث مہذبۃ واختصرہا''[۱۸] (**شاہ عبدالعزیز کی تصانیف میں ایک**

---

[۱۷] دہلوی، عبدالعزیز، عجالۂ نافعہ، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۳۸۳ھ، ص ۱

[۱۸] ترہتی، محمد محسن، الیانع الجنی، جیدپریس، دہلی، ۱۳۴۹ھ، ص ۷۴

کتاب بستان المحدثین ہے جس میں انہوں نے علوم حدیث کو عمدہ اور مختصر انداز میں جمع کردیا ہے)۔ مولانا عبدالرشید عراقی کے مطابق یہ کتاب مصنف کے علمی تبحر، وسعت معلومات اور تاریخ میں ان کے عبور و مہارت پر دلالت کرتی ہے[19]۔ اس کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

اس رسالہ کا نام بستان المحدثین ہے۔ چونکہ اکثر رسائل اور تصانیف میں ایسی کتب سے احادیث نقل کی جاتی ہیں جن کا علم لوگوں کو نہیں ہوتا اور سننے والے ان کتب کا نام سن کر حیران رہ جاتے ہیں تو اس کتاب کا اصل مقصد ان کتب کا تعارف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کتب کے مصنفین کا بھی تعارف آگیا ہے۔[20]

شاہ صاحب نے کتاب کا آغاز موطا امام مالک سے کیا ہے اور کتاب کے سولہ نسخوں اور امام مالک سے روایت کرکے ان کو جمع کرنے والوں کے حالات کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت ہے کہ شاہ صاحب کتب حدیث میں احادیث کی تعداد اور ثلاثیات کی تعداد بھی بتاتے ہیں۔ شاہ صاحب دیگر محققین کے برعکس سنن ابی مسلم الکشی، سنن سعید بن منصور اور مصنف عبدالرزاق کو ثلاثیات کی کثرت کے سبب نہایت اعلیٰ و ارفع مقام دیتے ہیں۔ یہ کتاب مطبع محمدی (لاہور) سے پہلی مرتبہ ۱۲۷۷ھ میں طبع ہوئی۔ پھر مطبع مجتبائی (دہلی) سے ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی دوسری مرتبہ گلزار محمدی (لاہور) سے اور تیسری مرتبہ نصرت المطابع (دہلی) سے ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوئی۔ دونوں اشاعتوں میں اغلاط کی کثرت ہے اور ضرورت ہے کہ اس کتاب کا تصحیح شدہ نسخہ تیار کیا جائے۔ انہی نسخوں کو سامنے رکھ کر مولانا عبدالسمیع دیوبندی نے ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۷ء میں اس کا اردو ترجمہ "روض الریاحین" کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے اور پاکستان و ہندوستان سے کئی مرتبہ طبع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ مناسب ہے لیکن اصل نسخوں کے اغلاط اس ترجمہ میں بھی در آئے ہیں۔ بستان المحدثین کا پہلا عربی ترجمہ مولانا محمد اشفاق سلفی کا ہے۔ جسے دار الداعی للنشر التوزیع (ریاض) نے اور ہندوستان میں بنارس سے ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک عربی ترجمہ شیخ صبحی الصالح السامرائی نے بھی کیا ہے۔ جس کا ذکر مجلہ "آفاق التراث" (دبئی) میں آیا ہے۔

---

[19] عراقی، عبدالرشید، خاندان ولی اللہی دہلوی کی تصنیفی خدمات، ص ۸۰

[20] دہلوی، عبدالعزیز، بستان المحدثین، مطبع محمدی، لاہور، س۔ن، ص ۲

اس کتاب کا فارسی سے عربی میں ڈاکٹر محمد اکرم ندوی نے بھی ترجمہ کیا ہے۔ یہ ۲۸۲ صفحات پر مشتمل ہے اور دارالغرب الاسلامی نے ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس کا عکسی نسخہ دارالکتب (پشاور) سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ندوی نے یہ تو لکھا ہے کہ "نقلته من اللغة الفارسية الى اللغة العربية"[21] لیکن یہ نہیں لکھا کہ اس کا کونسا فارسی نسخہ ان کے پیش نظر رہا۔ اس کتاب کا سب سے عمدہ ایڈیشن وہ ہے جسے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے اپنے حواشی واضافات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی (مظفر نگر) سے ۱۴۳۷ھ/۲۰۱۶ء میں طبع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ مولانا عبدالرحمٰن سلیمی خراسانی نے دارالعلوم زاہدان (ایران) سے دیگر نسخوں سے تقابل کر کے تیار کیا ہے جو کافی عمدہ ہے۔ ایک انگریزی ترجمہ عائشہ بیولے کا ہے جو ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء میں ۳۵۸ صفحات پر طبع ہوا۔

۴۔ سرالشہادتین (عربی): اس رسالہ میں شاہ عبدالعزیز دہلوی نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے فضائل اور شہادت کے واقعات کو مستند اور صحیح روایات کی روشنی میں تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی شہادت کو دراصل نبی کریم ﷺ کی شہادت قرار دیا ہے۔ انہوں نے شہادت کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک شہادت خفی دوسری شہادت جلی۔ پہلی قسم کی شہادت حضرت حسن کی ہے جبکہ دوسری شہادت حضرت حسین کی قرار دی ہے۔[22] اس رسالہ میں شہادت حسین پر ماتم کرنا، سینہ کوبی کرنا اور کالے کپڑے پہننے کو کتاب و سنت کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ شاہ صاحب نے اس رسالہ میں مستند روایات پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر پھر بھی بعض کمزور روایات اس میں در آئی ہیں۔ مثلاً یہ روایت کہ جب حضرت حسین شہید ہوئے تو چند روز آسمان روتا رہا۔ دوسری روایت کہ جب حضرت حسین شہید ہوئے تو تین دن اندھیرا رہا۔ تیسری روایت کہ نبی کریم ﷺ کا فرمانا کہ میرا بیٹا حسین کربلا میں شہید ہوگا۔[23]

سرالشہادتین لکھنے کا سبب شاہ صاحب نے اگرچہ کتاب کے آغاز میں نہیں لکھا۔ تاہم لگتا یہ ہے کہ ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء میں جب انہوں نے "تحفہ اثنا عشریہ" تحریر کی تو اس کا رد عمل بڑا شدید رہا۔ جہاں اہل

---

[21] دہلوی، عبدالعزیز، بستان المحدثین، (مترجم: ڈاکٹر محمد اکرم ندوی)، دارالغرب الاسلامی، بیروت، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷

[22] دہلوی، عبدالعزیز، سرالشہادتین، (ترتیب و حواشی: نیر ندیم)، احباب پبلشرز لکھنؤ، س۔ن، ص ۱۱۔۱۳

[23] ماخذ سابق، ص ۴۹۔۵۹

تشیع کے حلقوں میں اس کتاب کی اشاعت سے تہلکہ مچ گیا وہیں اہل سنت کے ایک طبقے میں ناصبیت کے اثرات پیدا ہونے لگے۔ ان اثرات کو زائل کرنے اور اعتدال فکر کے زیر اثر شاہ صاحب نے ''سر الشہادتین''تالیف فرمائی۔ جو پہلی مرتبہ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں طبع ہوئی۔ مولوی رحیم بخش دہلوی لکھتے ہیں: ''شہادت حسنین کے واقعہ کو اور لوگوں نے بھی بیان کیا ہے لیکن اس میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے اس کتاب میں صحیح واقعات بیان کیے ہیں''۔[۲۴] یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع مصطفائی (دہلی) نے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں شائع کی[۲۵]۔ پھر مطبع نظامی (کانپور) نے ۱۲۸۸ھ میں شائع کی۔ اس کے علاوہ مطبع احمدی، مطبع اخبار، مطبع نامی اور مطبع نولکشور سے بھی یہ رسالہ طبع ہوا۔ ''سر الشہادتین'' کا پہلا فارسی ترجمہ سید علی اکبر نے ''اظہار السعادت'' کے نام سے کیا۔ شاہ صاحب کے ایک شاگرد مولوی سلامت اللہ کشفی نے اس کی شرح ''تحریر الشہادتین'' کے نام سے کی جو ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی[۲۶]۔ اس کتاب کے قلمی نسخے بانکی پور اور علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس رسالہ کے متعدد اردو تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ اس کا پہلا اردو ترجمہ مرزا حسن علی اور دوسرا ترجمہ مولانا خرم علی بلہوری نے کیا جو مطبع مجتبائی (دہلی) سے ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نیر ندیم نے ترتیب و حواشی کے ساتھ احباب پبلشرز (لکھنؤ) سے اصل متن اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔ سید طیب آغا نے بھی اسے متن مع ترجمہ کے ساتھ شائع کیا۔ بعد ازاں سید کاظم رضا نے پنجاب نیشنل پریس (لاہور) سے اسے شائع کیا۔ اس کا ایک اردو ترجمہ ریاض صمدانی نے شہادت حسنین کے نام سے کیا ہے، جسے مکتبہ حامدیہ گنج بخش (لاہور) نے شائع کیا ہے۔ اسی طرح اس کی ایک شرح القلم ادارہ مطبوعات (اٹک) سے بھی شائع ہوئی ہے۔ کتب خانہ انجمن اردو (کراچی) نے بھی اس رسالہ کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

۵۔ عزیز الاقتباس (عربی): اس رسالہ کا مکمل نام ''عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس'' ہے۔ اس

---

[۲۴] دہلوی، رحیم بخش، حیات ولی، ص ۶۲۳

[۲۵] ڈاکٹر ثریا ڈار نے اس کی پہلی اشاعت کا سن تحریر نہیں کیا، ممکن ہے یہ اشاعت ان کے سامنے نہ ہو، اسی طرح انہوں نے اس کی دوسری اشاعت ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء مطبوعہ نولکشور قرار دی ہے، جو درست نہیں۔ اس کی دوسری اشاعت مطبع نظامی (کانپور) کی ہمارے پاس ہے جس پر سن اشاعت ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء درج ہے۔

[۲۶] ڈاکٹر ثریا ڈار نے اس شرح کی پہلی اشاعت ۱۲۵۶ھ/۱۸۷۳ء بیان کی ہے، جو درست نہیں۔

رسالہ میں شاہ صاحب نے خلفائے راشدین کے حالات و مناقب بیان کیے ہیں۔ڈاکٹر ثریاڈار لکھتی ہیں:

شاہ صاحب کے اس چھوٹے سے رسالے پر سرسری اور اجمالی نظر ڈالنے ہی سے اس کی قدروقیمت کا پتہ چل جاتاہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اپنے وقت کا بہترین رسالہ ہے۔[۲۷]

اس رسالہ کی اولین اشاعت کا علم نہیں ہو سکا۔تاہم یہ معلوم ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ شاہ صاحب کے شاگرد مرزا حسن علی لکھنوی نے کیا تھا۔تاہم اس کی بھی اشاعت کا علم نہیں ہو سکا۔مولوی نظام الدین کیرانوی نے اس کا اردو ترجمہ مع حواشی تحریر کیا تھااور اس ترجمہ پر حکیم عبدالغفور نے نظرثانی کی تھی۔ یہی ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء میں ظہیرالدین سید احمد ولی اللٰہی نے مطبع احمدی (دہلی) سے شائع کیا تھا۔ پاکستان میں ''فضائل صحابہ واہل بیت'' مرتبہ: پروفیسر ایوب قادری، مطبوعہ جاوید پریس (کراچی) سے بھی ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء میں یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

۶۔وسیلۃ النجات (فارسی): ''وسیلۃ النجات'' دراصل ایک سائل کے سوال کا جواب ہے سوال یہ تھا کہ اہل سنت اپنے مذہب کو قرآن وسنت کے موافق بتاتے ہیں اور اہل تشیع بھی اپنے مذہب کو قرآن وسنت کے موافق بتاتے ہیں۔ان میں سے ناجی (نجات یافتہ) کون ہے؟ شاہ صاحب خود اس کتاب کا سبب تالیف بیان کرتے ہیں:

اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ ہے کہ میرے واقفوں میں سے ایک شخص نے جو شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں مجھ سے درخواست کی کہ فرقہ ناجیہ (نجات یافتہ فرقے) کی حقیقت کے بارے میں چند دلائل معرض تحریر میں لاؤں۔ چنانچہ "الدین النصیحۃ" کے مطابق میں نے اس کی وضاحت کر دی اور اس رسالے کا نام ''وسیلۃ النجات'' رکھا۔[۲۸]

اس رسالے میں شاہ صاحب نے نہایت مختصر اور جامع اسلوب میں اہل سنت اور اہل تشیع کے مآخذ پر دلائل جمع کر دیے ہیں۔شاہ صاحب نے امام زین العابدین کے متعدد اقوال سے ثابت کیا ہے کہ اہل تشیع جو روایات بیان کرتے ہیں وہ درست نہیں۔کتاب کے اختتام پر ان دلائل کی روشنی میں لکھتے ہیں:

---

[۲۷] ثریاڈار، ڈاکٹر، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص ۲۸۵

[۲۸] دہلوی، عبدالعزیز، مجموعہ رسائل خمسہ شاہ عبدالعزیز دہلوی، مطبع فخر الدین، لاہور، ۱۲۰۸ھ، ص ۴۰

پس امام زین العابدین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل تشیع کی جملہ کتب اور روایات باطل اور افترا پر مبنی ہیں۔ اہل اسلام، محبان قرآن اور محبان اہل بیت پر فرض عین ہے کہ اس سے کنارہ اختیار کریں۔[۲۹]

یہ رسالہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ یہ فتاویٰ عزیزیہ مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں بھی ہے۔ نیز مطبع فخر الدین (لاہور) کے مجموعہ رسائل خمسہ شاہ عبدالعزیز میں بھی شامل ہے اور یہ اشاعت ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء کی ہے۔ پروفیسر ایوب قادری نے ''فضائل صحابہ واہل بیت'' کے عنوان سے شاہ عبدالعزیز کے جو تین رسائل شائع کیے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ اس کی اشاعت پاک اکیڈمی (کراچی) سے ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء میں ہوئی اور اب تک کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ''احسن الحسنات'' کے نام سے دہلی سے شائع ہوا تھا جس پر بعد ازاں حکیم عبدالغفور (م: ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء) نے نظر ثانی کی۔ اسی طرح مطبع کنز العلوم حیدرآباد دکن سے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء میں فتاویٰ عزیزیہ کا جو پہلا اردو ترجمہ شائع ہوا اس میں بھی یہ رسالہ شامل تھا۔ یہ ترجمہ مولوی محمد نواب علی اور مولوی عبدالجلیل نعمانی نے کیا تھا۔

۷۔ السر الجلیل (فارسی): اس رسالہ کا مکمل نام ''السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل'' ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی تالیف ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے اختتام کے طور پر اپنے بعض احباب کی خواہش پر یہ رسالہ تالیف فرمایا۔ اس کے آغاز میں شاہ صاحب خود فرماتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ کی عنایت سے تحفہ اثنا عشریہ کی تالیف سے فراغت حاصل ہوئی تو بعض مخلص دوستوں نے اس خواہش کا اظہار کیا اور بے حد اشتیاق سے استدعا کی کہ مسئلہ تفضیل اور صحیح تفضیلیت کی وضاحت کی جائے تاکہ ان مباحث میں جو ہر مجلس میں بیان کیے جاتے ہیں اور ہر محفل میں موضوع گفتگو بنتے ہیں کوئی گنجلک باقی نہ رہے۔ چنانچہ اس بنا پر یہی رسالہ ضبط تحریر میں لایا گیا اور اس کا نام ''السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل'' رکھا گیا ہے۔[۳۰]

اس رسالہ میں شاہ صاحب نے عقلی و نقلی دلائل سے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ فضیلت کا معیار اور اصول کیا ہیں؟ پھر ان اصولوں کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت تمام صحابہ پر قائم کی ہے۔ یہ

---

[۲۹] ماخذ سابق، ص ۵۵

[۳۰] دہلوی، عبدالعزیز، السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، مطبع انصاری، دہلی، ۱۳۱۰ھ، ص ۱

رسالہ گیارہ مقدمات پر مشتمل ہے۔ان میں گیارہ اصول ترجیح سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا اثبات کیا گیا ہے۔آخر میں شاہ صاحب نے صراحت فرمائی ہے کہ اس کو ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے تتمہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ رسالہ ''فتاویٰ عزیزیہ'' کی جلد دوم میں شامل ہے اور اس کی الگ اشاعتیں بھی ہوئی ہیں۔اس کی ایک قدیم اشاعت ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء کی ہے جسے مطبع انصاری (دہلی) نے شائع کیا ہے۔ اس اشاعت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس مطبع کے مالک محمد عنایت اللہ جالیسری نے اس میں تحشیہ اور تخریج کا اہم کام بھی کروایا ہے۔اس رسالہ کا اردو ترجمہ مفتی محمد شفیع نے کیا ہے جو اولاً ماہنامہ قاسم العلوم (دیوبند) سے باقساط ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۱ء میں طبع ہوا اور بعد ازاں پروفیسر محمد ایوب قادری نے اسے شاہ عبدالعزیز کے دیگر رسائل کے ساتھ فضائل صحابہ واہل بیت کے عنوان سے پاک اکیڈمی (کراچی) سے ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔

۸۔ ہدایت المومنین: اس رسالہ کا مکمل نام ''ہدایت المومنین بر حاشیہ سوالات عشرہ محرم'' ہے۔ یہ ایک سوال کے جواب میں تحریر کیا گیا۔ سوال یہ تھا کہ علمائے اہل سنت کے نزدیک عشرہ محرم کی تعزیہ داری، سینہ کوبی اور دیگر امور کے حوالے سے کیا رائے ہے؟ اس کا نام شاہ صاحب نے ''ہدایت المومنین'' لکھا ہے۔اسے تین فصلوں میں تقسیم کیا ہے جیسا کہ آغاز میں لکھتے ہیں:

> اس رسالہ کا نام ہدایت المومنین رکھا ہے اور سب مطالب اس کے ایک مقدمہ اور تین فصلوں میں بیان کیے اول مقدمہ بدعتوں کے ظاہر ہونے کا سبب مذکور ہو چکا۔اب پہلی فصل میں تعزیہ کی برائی دلیل عقلی اور شرعی سے مذکور ہے۔ دوسری فصل میں جاہلوں کے سوال کا جواب ہے۔ تیسری فصل میں آیات اور احادیث کی رو سے تعزیہ کی برائی کا بیان ہے۔[۳۱]

یہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ شاہ صاحب کے انتقال کے سال یعنی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء میں اس کا اردو زبان میں ترجمہ ہوا اور اس کا ذکر شاہ صاحب نے اس رسالہ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''اس وقت میں کہ سن بارہ سوانتالیس ہجری ہے یہ رسالہ ہندی زبان میں لکھا تا کہ ہر کوئی اپنی بولی میں سمجھ کر بے تکلف بوجھ لے اور سوچ پکڑے''۔[۳۲]

محققین کی نظر اس بات پر عموماً نہیں گئی کہ اس کا اردو ترجمہ شاہ صاحب کی نظر سے گزرا تھا، لیکن یہ

---

[۳۱] دہلوی عبدالعزیز، ہدایت المومنین، مطبع صدیقی، لاہور، ۱۳۰۲ھ، ص ۶

[۳۲] ماخذ سابق، ص ۵

شاید ان کی زندگی میں طبع نہیں ہو سکا تھا۔ اس رسالہ کا اردو ترجمہ شاہ صاحب کے شاگرد اور نواب صدیق حسن خان کے والد سید اولاد حسن قنوجی نے کیا ہے مترجم نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ :

ایک شخص نے چند سوال تعزیہ داری کے مقدمہ میں مولانا شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لکھ کر بھیجے تھے۔ سو آپ نے اس کے جواب میں جناب رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں سے ثبوت کر کر لکھے تھے جو لوگ کم علم تھے ان کی سمجھ میں اکثر نہیں آتے تھے۔ اس واسطے اس کو ہندی زبان میں کیا ہے۔ [۳۳]

اس رسالہ کی اولین فارسی طباعت کا علم نہیں۔ البتہ اس کا اولین اردو ترجمہ سید المطابع (دہلی) سے طبع ہوا۔ اس کی ایک اشاعت مطبع صدیقی (لاہور) کی بھی ہے جو ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں طبع ہوئی۔ اس رسالہ کی تردید میں سید ریاض الحسن نے ۱۹۳ صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام "نصر المومنین در جواب ہدایت المومنین" ہے۔ یہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء میں مطبع اثنا عشری (لکھنؤ) سے طبع ہوئی۔ سید ریاض الحسن نے کتاب کے آغاز میں لکھا ہے کہ یہ کتاب سید اولاد حسن قنوجی کی ہندی کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ حالانکہ سید اولاد حسن محض اس کتاب کے مترجم ہیں، اصل مؤلف شاہ عبدالعزیز ہیں۔ اس تردیدی کتاب کی زبان نہایت سطحی ہے جس کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ سید اولاد حسن کو ابو جہل سے نسبت دینے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی گئی۔ جب کہ یہ اعتراف بھی ہے کہ "ہدایت المومنین" میں کسی مذہب معین کا نام لے کر اس پر تنقید نہیں کی گئی۔ [۳۴]

۹۔ تحفہ اثنا عشریہ: تفسیر عزیزی کے بعد شاہ عبدالعزیز کی سب سے مشہور کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" ہے۔ یہ کتاب جس دور اور جن حالات میں لکھی گئی وہ دور برصغیر میں اہل تشیع مکتب فکر کے نظریات کے پھیلنے کا دور ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے کتاب کے لکھنے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ :

اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اور جس زمانہ میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلغلہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ

---

[۳۳] ماخذ سابق، ص ۲۔۳

[۳۴] تفصیل ملاحظہ ہو/ ریاض الحسن، سید، نصر المومنین در جواب ہدایت المومنین، مطبع اثناء عشری، لکھنؤ، ۱۳۱۵ھ، ص ۲۱

بمشکل کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں کوئی نہ کوئی یہ مذہب اختیار نہ کرچکا ہو یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔[۳۵]

کتاب کا نام ''تحفہ اثنا عشریہ'' رکھنے کا سبب یہ بتایا کہ یہ کتاب بارہویں صدی ہجری کے اختتام پر منظر عام پر آرہی ہے۔ حالانکہ کتاب میں اہل تشیع کے فرقہ اثنا عشریہ کے حوالے سے اصولی مباحث پر بحث کی گئی ہے۔ یہ ذو معنی تعبیر شاہ صاحب کی ذہانت کی دلیل ہے۔ اس طرح شاہ صاحب نے کتاب کو اہل تشیع کے بارہ اماموں کی تعداد کے مطابق بارہ ابواب پر تقسیم کیا۔

کتاب ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں تحریر کی گئی۔ اس کی پہلی طباعت ''مقالات طریقت'' کے مولف نے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء قرار دی ہے۔[۳۶] ڈاکٹر عضد الدین خاں کے مطابق اس طبع اول کی تعداد تین سو تھی۔[۳۷] پروفیسر اقبال مجددی کے مطابق اس کی پہلی طباعت مولف کے حین حیات ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء کو کلکتہ سے ہوئی تھی جبکہ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء کو کلکتہ سے ہی طبع ہوا[۳۸] ڈاکٹر ثریا ڈار نے بھی اس کی پہلی اشاعت ۱۲۱۵ھ/۱۷۹۹ء قرار دی ہے[۳۹]۔ لیکن ان تمام محققین کی آراء کو درج ذیل قرائن کی بنا پر درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔

- اس کتاب کے اگرچہ متعدد ایڈیشن شائع ہوئے لیکن ان میں سب سے قدیم ایڈیشن مطبع ثمر ہند (لکھنؤ) کا ہے جو ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء کا ہے۔
- تحفہ اثنا عشریہ کی تالیف کے بعد شاہ صاحب کے معاصر حکیم مرزا محمد دہلوی (م: ۱۲۳۵ھ

---

[۳۵] دہلوی، عبدالعزیز، تحفہ اثنا عشریہ، مطبع نامی نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۰۲ھ، ص ۳

[۳۶] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت، ص ۸۰

[۳۷] محمد عضد الدین، مقالات طریقت، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، ج ۹۶، شمارہ ۳۰، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۵

[۳۸] مجددی، محمد اقبال، شاہ عبدالعزیز دہلوی (مقدمہ) ص ۲۷/ ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء والے ایڈیشن کے خاتمۃ الطبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں درج عربی عبارات کا فارسی ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن مطبوعہ ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء بھی ملتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جابجا حواشی و تعلیقات درج ہیں۔ تاہم اس طباعت کے آغاز و انجام میں اس محشی کا نام درج نہیں ہے۔ بعض دیگر اشاعتوں کا ذکر ڈاکٹر عارف نوشاہی نے اپنی کتاب ''کتابشناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ''، ج ۱، ص ۴۲۷-۴۲۸ میں کیا ہے۔ تفصیل وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

[۳۹] ثریا ڈار، ڈاکٹر، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ص ۲۷۴

/۱۸۲۰ء) نے اس کے رد میں ''نزہۃ تحفہ اثنا عشریہ'' [۴۰] تالیف کی جس کا سن تالیف ۱۲۰۶ھ /۱۷۹۲ء ہے۔ اگر ''تحفہ اثنا عشریہ'' ۱۲۱۵ھ /۱۸۰۰ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی تھی تو اس کا رد اس کی اشاعت سے آٹھ سال پہلے کیسے لکھا گیا؟

- خود شاہ صاحب نے اس کا نام ''تحفہ اثنا عشریہ'' رکھنے کا ایک سبب یہ بتایا ہے کہ یہ کتاب بارہویں صدی ہجری میں منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ اس کتاب کو شاہ صاحب کی زندگی میں ہی شہرت اور وقعت ملنا شروع ہو گئی تھی چنانچہ اس کتاب کے رد میں جس کثرت سے اہل تشیع کی جانب سے کتب لکھی گئیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے اہل تشیع کے حلقوں میں ہلچل مچادی تھی۔ [۴۱] بنابریں یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب کے نتیجے میں اہل سنت کے کم علم اور عوامی حلقے اہل تشیع کے پس پردہ حقائق اور ان کی تاریخ اور اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین اصولی اختلافات سے واقف ہوئے۔ اس طرح شاہ صاحب اپنے مقاصد میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے۔

اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ مولوی محمد سعید اسلمی مدراسی (م: ۱۲۷۲ھ /۱۸۵۵ء) نے کیا جو

---

[۴۰] حکیم مرزا محمد دہلوی کی کتاب ''نزہۃ تحفہ اثنا عشریہ'' دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اسے مطبع جعفری (لکھنؤ) نے شائع کیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ تحفہ اثنا عشریہ کا پہلا رد تھا۔ اس کتاب کو تقریباً تمام قابل قدر محققین نے شیعہ عالم مولانا دلدار علی نصیر آبادی (۱۲۳۵ھ /۱۸۲۰ء) سے منسوب کیا ہے۔ یہ کتاب اگر ہمارے پاس نہ ہوتی تو شاید ہم بھی اس کا اعتبار کر لیتے۔ لیکن کتاب پر مؤلف کا نام حکیم مرزا محمد دہلوی درج ہے۔ ممکن ہے مولانا دلدار علی نے اس کتاب پر کوئی حاشیہ چڑھایا ہو جو ان کے نام سے مشہور ہو گیا۔

[۴۱] ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے رد میں اہل تشیع علماء نے جتنی کتب تحریر کی ہیں، شاید اس سے قبل اس موضوع پر کسی اور کتاب کی تردید میں اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ بعض شیعہ علماء نے تو اپنی زندگی ہی اس کتاب کی تردید میں صرف کر دی۔ چنانچہ سید محمد قلی خان کنتوری نے اس کتاب کے رد میں کئی رسائل لکھے اور پھر ان کے فرزند حامد حسین کنتوری کے بارے میں مولانا عبد الحی حسنی لکھنوی نے لکھا ہے کہ ''فانہ صرف عمرہ فی الرد علی التحفۃ'' (لکھنوی، عبد الحی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص ۲۲۰) اہل تشیع علماء نے تحفہ کے رد میں جو کتب لکھی ہیں ان کا ذکر تفصیل کا متقاضی ہے۔ مولانا عبد الحی نے ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' اور علامہ اعجاز حسین کنتوری نے ''کشف الحجب والاستار'' میں ان کتب کی فہرست اور تفصیل دی ہے جو ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

مولف کی زندگی میں سنہ ۱۲۲۷ھ /۱۸۱۲ء کو مکمل ہوا۔اس ترجمہ کا ذکر خود شاہ صاحب نے بھی کیا ہے۔[۴۲] "مختصر التحفة الاثنی عشریة" کے نام سے اس کا عربی خلاصہ سید محمود شکری الآلوسی نے کیا ہے، جس پر کچھ مزید کام شیخ غلام محمد بن محی الدین عمر الاسلمی نے کیا ہے اور تحقیق و تعلیق محب الدین الخطیب نے کی ہے۔ یہ کتاب ریاض (سعودی عرب) سے ۱۴۰۴ھ /۱۹۸۳ء میں طبع ہوئی ہے۔اردو زبان میں اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ سر سید احمد خان (م:۱۳۱۵ھ /۱۸۹۸ء) نے ۱۲۶۹ھ /۱۸۴۴ء میں کیا جو بقول الطاف حسین حالی طبع بھی ہوا۔[۴۳] تاہم یہ ترجمہ کتاب کے باب نہم و دہم کا ترجمہ تھا،اس اعتبار سے نامکمل ترجمہ تھا۔یہ ترجمہ "تحفہ حسن" کے نام سے شائع ہوا تھااور اس ترجمہ میں سر سید نے اپنے استاد مولوی نورالحسن کی مدد بھی حاصل کی تھی۔اردو زبان میں دوسرا ترجمہ جو مکمل ہے،وہ مولوی عبدالمجید خان پیلی بھیتی کے "ہدیہ مجیدیہ" کے نام سے ہے۔ یہ ترجمہ نور محمد۔اصح المطابع (کراچی) نے طبع کیا ہے، جس کے اختتام پر خاتمہ مترجم کے تحت اس ترجمہ کی تکمیل ۱۳۰۷ھ /۱۸۹۰ء درج ہے۔اس ترجمہ کی پہلی اشاعت کا علم نہیں ہو سکا۔اس کتاب کا تیسرا ترجمہ مولوی سعد حسن خان یوسفی نے بھی کیا ہے جسے مکتبہ دانش (دیوبند) نے شائع کیا ہے۔اس کتاب کا چوتھا اردو ترجمہ مولانا خلیل الرحمان نعمانی نے ۱۴۰۲ھ /۱۹۸۲ء میں کیا جسے دارالاشاعت (کراچی) نے شائع کیا۔پہلے دو مکمل تراجم قدیم اور متروک الفاظ کے سبب قابل استفادہ نہیں جبکہ آخر الذکر ترجمہ میں کئی عبارتوں کے تراجم یا تو رہ گئے ہیں یا پھر مبہم اور مجہول بنادیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے شایان شان ترجمہ اور مغلق عبارات پر تعلیق کا اہم کام اب بھی محققین کی توجہ کا طالب ہے۔"تحفہ اثنا عشریہ" کے حوالے سے چند مغالطوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے:

- "تحفہ اثنا عشریہ" کے شروع میں شاہ عبدالعزیز نے اپنا تاریخی نام "غلام حلیم" درج کیا ہے جبکہ اپنی دیگر کتب میں "عبدالعزیز" لکھا ہے۔اس سے بعض محققین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انہوں نے ایسا اہل تشیع کے ضرر سے بچنے کی غرض سے کیا۔ ممکن ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو۔ لیکن اپنے شاگرد مرزا حسن علی کو جو جوابی مکتوب شاہ صاحب نے تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنا اصل نام اس لیے پوشیدہ رکھا کہ وہ اس

[۴۲] دہلوی، عبدالعزیز، ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص ٦٦

[۴۳] حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، مطبع نامی، کانپور، ۱۹۰۱ء، ص ۵۱

تصنیف پر فخر یا خوشی محسوس نہ کرتے تھے اور نہ اس تصنیف سے ان کا مقصد شہرت حاصل کرنا تھا۔[۴۴] نیز وہ اپنے نام کو مخفی رکھ کر اس کے پڑھنے والوں کا دائرہ بڑھانا چاہتے تھے۔

- ایک غلط فہمی یہ ہے کہ ''تحفہ اثنا عشریہ'' میں امیر معاویہ کے حوالے سے کچھ سخت الفاظ آ گئے ہیں۔ شاہ صاحب کے حین حیات ہی اس کتاب میں تحریفات ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ اپنے ایک معتقد کے جواب میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ وتعریضات در باب معاویہ رضی اللہ عنہ ازیں فقیر واقع نشدہ۔ اگر در نسخہ از تحفہ اثنا عشریہ یافتہ شود الحاق کسے خواہد بود۔ وایں تعریضات در نسخہ معتبرہ البتہ نخواہد شد۔[۴۵] (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اس فقیر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اگر تحفہ اثنا عشریہ کے کسی نسخے میں ایسی کوئی عبارت نظر آئے تو وہ کسی نے اپنی طرف سے بڑھادی ہیں۔ یہ اعتراضات معتبر نسخوں میں ہر گز نہیں نظر آئیں گے)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی کتاب پر یہ الزام درست نہیں۔
- ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے حوالے سے شیعہ علماء کی جانب سے ایک الزام یہ لگایا گیا کہ یہ کتاب ملا نصر اللہ کابلی کی کتاب ''صواعق موبقہ'' کا سرقہ ہے۔ جس پر آپ کے شاگرد مرزا حسن علی نے بذریعہ خط جواب چاہا تو شاہ صاحب نے لکھا کہ یہ درست نہیں۔ ملا نصر اللہ کابلی کی مذکورہ کتاب تو بہت ناقص ہے اور یہ اہل تشیع کے تمام اعتراضات کے جوابات پر مشتمل نہیں ہے۔[۴۶]
- عبدالرحیم ضیاء کے مطابق ہندوستان کے ایک شیعہ نواب نے ایک کثیر رقم اس کتاب کی تردید لکھنے کے لیے ایران کے شیعہ علماء کے پاس بھجوائی تھی مگر ان کا جواب آیا کہ صاحب تحفہ اثنا عشریہ نے اپنی کتاب میں جن علمی مآخذ کا ذکر کیا ہے، وہ کتابیں اگرچہ درست ہیں مگر ہم نے بھی محض ان کے بارے میں سنا ہے، دیکھی کبھی نہیں۔[۴۷] اس تفصیلی عبارت کے خلاصہ سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اہل تشیع کے نادر و کمیاب

---

[۴۴] دہلوی، عبدالعزیز، فتاویٰ عزیزی، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۱۱ھ، ص ۱۳۸

[۴۵] برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، ص ۱۵۴

[۴۶] دہلوی، عبدالعزیز، فتاویٰ عزیزی، ص ۱۳۸

[۴۷] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت، ص ۸۰

نسخوں سے دلائل جمع کیے۔ کتاب کی علمیت اپنی جگہ مگر یہ عبارت شاید مبالغہ پر مبنی ہے۔ کیونکہ تحفہ اثنا عشریہ میں محض چند کتب کو چھوڑ کر کوئی ایسا ماخذ نہیں جو اس دور میں دستیاب نہ ہو۔ تحفہ اثنا عشریہ کے رد میں لکھی جانے والی کتب میں شاہ صاحب کے ذکر کردہ مآخذ کی کثرت ملتی ہے جو مبالغہ پر مبنی اس مغالطہ کا رد کرتی ہے۔

- ''تحفہ اثنا عشریہ'' کا پہلا رد ''نزہۃ تحفہ اثنا عشریہ'' کے نام سے مطبوعہ ہے جس کے بارے میں غلط فہمی ہے کہ یہ شیعہ عالم مولانا دلدار علی کا لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ حکیم مرزا محمد دہلوی کا لکھا ہوا ہے اسی طرح مشہور ہے کہ اس کا رد ''عزۃ الراشدین'' کے نام سے خود شاہ عبدالعزیز نے لکھا حالانکہ یہ درست نہیں اور اس نام کی کوئی کتاب شاہ صاحب کی نہیں ملتی۔
- ایک مغالطہ یہ ہے کہ ''تحفہ اثنا عشریہ'' لکھنے کی پاداش میں امیر الامراء مرزا نجف خاں نے آپ کی جائیداد ضبط کر لی تھی اور آپ پر بے جا سختی کی تھی۔ جائیداد ضبطی والی بات تو درست ہے لیکن ایسا ''تحفہ اثنا عشریہ'' کے لکھنے کے سبب ہوا، یہ درست نہیں۔ کیونکہ نجف خاں کا انتقال ۱۱۹۶ھ/۸۲-۱۷۸۱ء میں ہو گیا تھا، گویا ''تحفہ اثنا عشریہ'' اس کے انتقال کے بعد لکھی گئی۔

بہر حال ''تحفہ اثنا عشریہ'' نے اپنے دور کے عمومی تقاضوں کے پیش نظر عوامی حلقوں میں پھیلنے والی غلط فہمیوں کا بہت حد تک ازالہ کیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' میں جن اصولی نکات پر بات کی ہے ''تحفہ اثنا عشریہ'' اسی کی شرح ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اہل تشیع کے کردار کا اور اثر و نفوذ کے تناظر میں اس کتاب کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

> مذہبی تاریخ کا طالب علم یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہے کہ اٹھارہویں صدی میں شیعہ مذہب کا جو فروغ شروع ہوا تھا۔ اسے روکنے میں تحفہ اثنا عشریہ کا بڑا دخل تھا۔[۴۸]

بہر حال اب تک ''تحفہ اثنا عشریہ'' کو شیعہ سنی مسئلہ کے حوالے سے ایک مناظرانہ اور فرقہ وارانہ کتاب کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کتاب کو شیعہ سنی مسئلہ میں اصولی اور حقیقی مباحث کے حوالے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے حوالے سے اگر کوئی شعوری کوشش کی جائے تو یہ کتاب ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

---

[۴۸] محمد اکرام، شیخ، رود کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۹ء ص ۵۹۵

۱۰۔ فتاویٰ عزیزی (فارسی): شاہ عبدالعزیز کے خاندانی پس منظر، علمی تبحر اور فقہی بصیرت کے سبب برصغیر کا مسلم طبقہ اپنے دینی مسائل کے حل کے لیے آپ کی طرف رجوع کرتا تھا۔ اگر شاہ صاحب کی علمی و فکری ہمہ جہتی کا جائزہ مقصود ہو تو اس کے لیے آپ کے فتاویٰ کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے دور کے مخصوص حالات کے تناظر میں برصغیر کے مسلمانوں کے کثیر الجہت مسائل کا جواب دے کر ان کی دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ ان فتاویٰ میں شاہ صاحب نے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوف، سیاست اور اپنے دور کے فرقوں کے عقائد پر بحث کی ہے۔ فتاویٰ عزیزی میں شاہ صاحب کے بعض اہم رسائل بھی آگئے ہیں جن میں سے اکثر اب ناپید ہیں۔ ان فتاویٰ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دور میں کس نوعیت کے علمی سوالات گردش میں تھے۔ انہی فتاویٰ میں شاہ صاحب کا فتویٰ دارالحرب بھی شامل ہے جس میں شاہ صاحب نے اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی ہیئت شرعی پر بحث کی ہے۔ اس فتویٰ کی پاداش میں شاہ صاحب کو شاہ عالم (م: ۱۷۰۹ء۔۱۸۰۶ء) کی عطا کردہ جاگیر سے محروم کیا گیا۔ جاگیر ضبطی کے ساتھ آپ کو دہلی بدر بھی کیا گیا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۷ء میں یہ جاگیر واگزار ہوئی۔

فتاویٰ عزیزی کی اولین اشاعت کے حوالے سے ہم لاعلم ہیں۔ تاہم اس کی دستیاب اشاعتوں میں اولین اشاعت مطبع مجتبائی (دہلی) کی ہے جو مطبع کے مالک مولوی عبدالاحد نے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں مولوی محمد احسن کی تصحیح اور نواب مبارک علی خاں کی ''کمالات عزیزی'' کے ساتھ شائع کی ہے۔ بعد ازاں مطبع مجتبائی (دہلی) ہی نے ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء اور پھر ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۹ء اور پھر ۱۳۴۱ھ/۱۹۰۵ء اور پھر ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۹ء اور پھر ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں بھی اس کو شائع کیا۔ یہ تمام اشاعتیں دو جلدوں پر مشتمل تھیں اور فتاویٰ کی تعداد چار سو سے متجاوز تھی۔ اس کتاب کا پہلا اردو ترجمہ مولانا محمد نواب علی اور مولانا عبدالجلیل نعمانی نے کیا تھا جو مطبع کنزالعلوم (حیدرآباد۔ دکن) سے محض ایک ہی بار ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۶ء میں ''فتاویٰ العزیزیہ'' کے عنوان سے طبع ہوا۔ اس کا دوسرا اردو ترجمہ مولوی عبدالواجد نولوی غازی پوری نے کیا جو ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۶ء میں مطبع مجیدی (کانپور) سے ''سرور عزیزی'' کے عنوان سے طبع ہوا۔ بعد ازاں حاجی محمد زکی نے ''فتاویٰ عزیزی'' کے ترجمہ ''سرور عزیزی'' کو سعید۔ ایچ ایم۔ کمپنی (کراچی) سے ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۸ء میں شائع کیا۔ اس اشاعت میں فتاویٰ عزیزی کو طرز جدید، ابواب بندی اور تسہیل کے ساتھ شائع کیا گیا۔ تاہم ترجمہ میں ثقالت اور تعبیر کی اغلاط موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ''فتاویٰ عزیزیہ'' پر کوئی محقق تحشیہ و تعلیق اور مختلف نسخوں کے تقابل کا اہم کام سرانجام دے۔ یہ کام

پی ایچ۔ڈی سطح کے تحقیقی مقالے کا عنوان بھی بن سکتا ہے۔

۱۱۔ ملفوظات عزیزی (فارسی): صوفیہ کے ارشادات کو قلم بند کرنے کی روایت کافی قدیم ہے۔ جن کو ملفوظات کہا جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات پر مشتمل اس کتاب کے مرتب کے حوالے سے تاریخی مآخذ خاموش ہیں۔ تاہم کتاب کے آغاز میں مرتب نے لکھا ہے کہ وہ ۱۶ رجب تا شوال ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۸ء تک شاہ عبدالعزیز کی مجالس میں شریک رہا اور ان کے ارشادات کو قلم بند کرتا رہا۔[۴۹] گویا یہ ملفوظات صرف تین ماہ کی مجالس کا حاصل ہیں۔ ان ملفوظات سے شاہ صاحب کی شخصیت کے حوالے سے کئی اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم ملفوظات کی زبان سے لگتا یہ ہے کہ مرتب کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مرتب کا نام معلوم نہ ہونے کے سبب سید ظہیر الدین دہلوی نے اسے شاہ صاحب سے غلط طور پر منسوب قرار دیا تھا۔[۵۰] تاہم یہ بات اس وجہ سے درست قرار نہیں دی جاسکتی کہ اس میں ذکر کردہ متعدد نکات شاہ صاحب کی دیگر کتب میں بھی قدرے تفصیل سے ملتے ہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اس میں مرتب کی جانب سے کچھ اضافے اور الحاقات ہوئے ہوں۔ حکیم برکاتی اس میں الحاق کے قائل نظر آتے ہیں۔[۵۱]

قاضی بشیر الدین میرٹھی نے اس کا فارسی متن مطبع مجتبائی (میرٹھ) سے ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا تھا۔ اس کا پہلا اردو ترجمہ مولوی عظمت الٰہی نے ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں کیا جسے مطبع ہاشمی (میرٹھ) نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا دوسرا اردو ترجمہ ۱۳۷۷ھ/۱۹۴۰ء میں مولوی محمد علی قریشی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے کیا اور اس ترجمہ کو ۱۳۷۹ھ/۱۹۶۰ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (کراچی) نے شائع کیا۔ پروفیسر عضد الدین خاں نے انگریزی مقدمہ کے ساتھ اس کا فارسی متن ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء میں کراچی سے طبع کر دیا تھا اور اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیا تھا مگر اس ترجمہ میں بھی فارسی متن کے اغلاط در آئے ہیں۔ ۱۴۳۷ھ/۲۰۱۶ء میں پروفیسر عضد الدین خاں کا یہ ترجمہ کتاب محل

---

[۴۹] دہلوی، عبدالعزیز، ملفوظات (مقدمہ)، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۱۳۱۱ھ، ص ۱

[۵۰] دہلوی، شاہ ولی اللہ، انفاس العارفین (اختتامی صفحہ)، مطبع احمدی، دہلی

[۵۱] حکیم محمود احمد برکاتی کے مطابق ملفوظات شاہ صاحب کے ہی ہیں مگر ان میں الحاق ضرور ہوا ہے اور بعض فحش اشعار اور فحش واقعات درج کر دیے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، ص ۲۶)

(لاہور) سے طبع ہوا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملفوظات کے نو دریافت خطی نسخوں[۵۲] کی مدد سے اس کا فارسی متن مرتب کر کے شائع کیا جائے۔

۱۲۔ فیض عام (فارسی): شاہ عبدالعزیز کے ایک عقیدت مند مولوی نعیم الدین ساکن موضع بردوان پرگنہ حویلی ڈھاکہ جلال پور ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء میں دہلی آئے اور آپ سے چند سوالات کیے، آپ نے ان کے جوابات دیے تو وہ انھوں نے لکھ لیے اور پھر ایک رسالہ کی صورت میں اسے مطبع مصطفائی (کانپور) سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں شائع کروایا۔ اس رسالہ کا دوسرا مطبوعہ نسخہ ''مجموعہ رسائل خمسہ شاہ عبدالعزیز دہلوی'' کے ذیل میں ملتا ہے۔ جسے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء میں مطبع فخر الدین (لاہور) نے شائع کیا ہے۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل اس رسالہ کا اب تک اردو ترجمہ نہیں ہوا۔ کتاب کی زبان نہایت سادہ اور اسلوب مختصر اور اجمالی ہے۔ ان سوالات میں بعض اہم معلومات بھی آگئی ہیں۔ مثلاً سائل کے ایک سوال کے جواب میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے خانوادے کے مجربات و وظائف کا خلاصہ شاہ محمد عاشق پھلتی نے کتاب ''سبیل الرشاد'' میں جمع کر دیے ہیں۔[۵۳] سائل نے شاہ صاحب سے ان کا استعمال شدہ کوئی کپڑا اس غرض سے مانگا ہے کہ وہ اسے اپنا کفن بنا سکے اور شاہ صاحب نے اس کی حامی بھری ہے۔[۵۴] سائل نے حلال روزی کے حوالے سے پوچھا ہے تو شاہ صاحب نے اس کے جواب میں حلال رزق کے چار ذرائع لکھے ہیں:

اول: ملازمت جس میں کفر و ظلم کی اعانت نہ ہو۔

دوم: زراعت جس میں کام کرنے والوں کے حقوق تلف نہ ہوں۔

سوم: تجارت جس میں صارف کے ساتھ دھوکہ نہ ہو۔

---

[۵۲] ملفوظات کا ایک قلمی نسخہ جس کی نقل ۲۹ جمادی الثانیہ ۱۲۹۴ھ/۱۱ جولائی ۱۸۷۷ء کو محمد عطا علی نے تحریر کی تھی جواہر میوزیم (اٹاوہ) کے ذخیرہ مخطوطات میں ہے جواب مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) میں محفوظ ہے۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے ملفوظات کے مطبوعہ نسخے سے اس کا مقابلہ ایک چوتھائی حصے کے بقدر کیا تو ان کا بیان ہے کہ مطبوعہ نسخہ میں بہت سی غلطیاں پائی گئی ہیں۔ اس کا اعتراف ملفوظات کے ناشر قاضی بشیر الدین میرٹھی نے مقدمہ ملفوظات میں بھی کیا ہے۔ اردو ترجمہ جو کراچی سے شائع ہوا وہ کہیں غلط در غلط اور بعض واقع پر مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملفوظات کا مصحح نسخہ تیار کیا جائے۔

[۵۳] دہلوی، عبدالعزیز، فیض عام، مطبع مصطفائی، کانپور، ۱۲۶۶ھ، ص ۵

[۵۴] ماخذ سابق، ص ۹

چہارم: صنعت و حرفت جس میں عرفی شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہو۔[۵۵]

۱۳۔ کمالات عزیزی (فارسی): یہ کتاب دراصل شاہ صاحب کے حالات، کرامات، ارشادات، مجربات اور عملیات کا مجموعہ ہے۔ حالات دراصل شاہ صاحب کے شاگرد نواب مبارک علی خاں کی ''حالات عزیزی'' سے لیے گئے ہیں، جو مطبع احمدی (دہلی) سے سب سے پہلے طبع ہوئی تھی۔ ''حالات عزیزی'' میں شاہ صاحب کی شخصیت کے حوالے سے بہت سے واقعات ہیں جن سے ان کی شخصیت اور اخلاق و اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب شاہ صاحب کے حوالے سے اولین مآخذ میں سے ایک ہے۔ دیگر میں ''کرامات عزیزی''، بھی مطبع احمدی (دہلی) نے شائع کی تھی اور دیگر حصے بھی اس ادارہ نے شائع کیے تھے۔ ان کی اشاعت مطبع مجتبائی (دہلی) سے بھی ہوئی۔ پھر ان تمام حصوں کو ''مجموعہ کمالات عزیزی'' کے نام سے مطبع مجیدی (کانپور) نے شائع کیا۔ پاکستان میں سعید۔ ایچ۔ ایم کمپنی (کراچی) ۱۴۰۸ھ /۱۹۸۸ء سے شائع ہوئی اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۴۔ مکتوبات عزیزیہ (فارسی/عربی): شاہ صاحب کے مکاتیب کا باقاعدہ مجموعہ مرتب صورت میں نہیں ملتا۔ اس حوالے سے آپ کے بعض مکاتیب کے حوالے سے ضمنی کام درج ذیل ہیں:

- آپ کے بعض مکاتیب ''مآثر الابرار'' میں شامل ہیں، جو شاہ اہل اللہ، مولانا نوراللہ اور شاہ محمد عاشق کے مکاتیب کے جوابات ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی نے ''حضرت شاہ ابوسعید حسنی'' کے نام سے کتابی صورت میں مکتبہ الفرقان (لکھنؤ) سے ۱۴۰۹ھ /۱۹۸۹ء میں شائع کیا تھا۔
- مولانا فریدی ہی کی کتاب ''تذکرہ شاہ عبدالعزیز'' میں مولانا رشید الدین دہلوی کی قلمی بیاض سے مکتوبات نقل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں سابقہ ذکر کردہ مکاتیب بھی شامل ہیں۔ مولانا فریدی کے مطابق اس بیاض میں جتنے مکاتیب ہیں وہ نادر و نایاب اور غیر مطبوعہ ہیں۔ تاہم اس بیاض کے بعض مکاتیب دیگر کتب میں بھی آئے ہیں۔
- فتاویٰ عبدالعزیز، آثار الصنادید اور حیات ولی میں بھی آپ کے بعض مکاتیب ملتے ہیں۔
- ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے ''فضائل صحابہ و اہل بیت'' میں شاہ عبدالعزیز کے چند مکاتیب شامل کیے ہیں جن کا اردو ترجمہ مولوی محمد سلیمان بدایونی نے کیا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری

---

[۵۵] ماخذ سابق، ص ۱۰

(علی گڑھ) میں بھی آپ کا ایک ادبی مکتوب ''لب لعل'' کے عنوان سے محفوظ ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر معین الدین عقیل نے انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (ملائشیا) کے کتب خانہ میں موجود شاہ صاحب کا ایک ادبی مکتوب بھی شائع کر دیا ہے۔ یہ مکتوب بھی مولانا آزاد لائبریری والا ہی ہے۔ اسی طرح رضا لائبریری (رام پور) سے بھی شاہ صاحب کے بعض مکاتیب مع قلمی عکس طبع ہو چکے ہیں۔

- ضرورت اس امر کی ہے کہ شاہ صاحب کے مکاتیب کے ان بکھرے ہوئے صحیفوں کو یکجا کیا جائے اور تحقیق و تعلیق کے ساتھ طبع کیا جائے۔ یہ کام پی ایچ۔ ڈی سطح کی تحقیق کا موضوع بھی بن سکتا ہے۔

۱۵۔ میزان البلاغت (فارسی): یہ رسالہ علم بلاغت پر ہے جو گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ ایک طویل عرصہ تک مجموعہ کتب میں مخفی رہا اور منظر عام پر نہ آسکا۔ بالآخر شیخ بشیر الدین میرٹھی نے اسے ذخیرہ کتب سے نکال کر تعلیقات و حواشی سے مزین کرنا چاہا۔ لیکن بعض علمی مصروفیات کے سبب یہ کام مولانا عزیز الرحمٰن کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے اس پر مفید حواشی کا اضافہ کیا اور شیخ بشیر الدین میرٹھی کی تصحیح کے بعد اسے ''العجالۃ النافعہ والعلالۃ الرائعۃ المسمیٰ بہ میزان البلاغت'' کے عنوان سے مطبع مجتبائی (میرٹھ) نے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں شائع کیا۔ اس کی شرح قاضی ارتضیٰ علی خاں گوپامئوی اور عبدالقادر رامپوری نے لکھی تھی۔

۱۶۔ میزان العقائد (عربی): اس رسالہ میں شاہ صاحب نے ''شرح عقائد'' پر بعض حواشی تحریر کیے ہیں۔ حیات ولی کے مولف نے اس کی بہت تعریف کی ہے مگر لکھا ہے کہ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔[۵۶] حالانکہ ''حیات ولی'' کی تالیف سے قبل اس کی اشاعت مطبع احمدی (دہلی) سے ہو چکی تھی۔ ممکن ہے ان کی نظر سے یہ مطبوعہ نسخہ نہ گزرا ہو۔ انہوں نے یہ مسودات اپنے ایک دوست کے پاس قلمی شکل میں دیکھے تھے۔ مولوی عبدالرحیم دہلوی لکھتے ہیں: ''شرح عقائد کے اگرچہ بہت سے حواشی اور تراجم میری نظر سے گزرے ہیں لیکن یہ حواشی اپنی طرز میں بالکل نرالے اور انوکھے ہیں''۔[۵۷]

ان رسائل اور کتب کے علاوہ آپ کی بعض دیگر کتب جن کا تذکرہ تاریخی مآخذ میں ملتا ہے۔ ان کی

---

[۵۶] دہلوی، عبدالرحیم، حیات ولی، ص ۶۲۱

[۵۷] ماخذ سابق

فہرست درج ذیل ہے:

۱۷۔ شرح میزان المنطق (عربی)[۵۸]

۱۸۔ حواشی بر بدیع الزمان (عربی)[۵۹]

۱۹۔ رسالہ در دفاع حضرت مجدد الف ثانی (فارسی)[۶۰]

۲۰۔ حواشی المقدمہ السنیہ (عربی)[۶۱]

۲۱۔ مجموعہ خطب خاندان عزیزیہ (فارسی)[۶۲]

۲۲۔ النفائس الارتضائیہ (عربی)[۶۳]

۲۳۔ حدیث الثقلین (عربی)[۶۴]

۲۴۔ فیما یحب حفظہ للناظر (عربی)[۶۵]

---

[۵۸] اس کا ذکر حیات ولی، ص ۶۲۰ پر آیا ہے۔ تاہم اس کا کوئی مطبوعہ نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

[۵۹] اس کا ذکر بھی حیات ولی، ص ۶۲۰ پر آیا ہے۔ تاہم اس کا بھی کوئی مطبوعہ نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

[۶۰] یہ رسالہ ''فتاویٰ عزیزی'' میں بھی شامل ہے۔ الگ سے ''رسالہ حلت'' اور ''رسالہ دفع اعتراضات'' کے عنوان سے پٹنہ اور دیوبند سے طبع ہوا ہے۔ یہ رسالہ شاہ غلام علی دہلوی نے اپنے رسالہ رد اعتراضات کی فصل چہارم میں شامل کر لیا تھا۔

[۶۱] شاہ ولی اللہ نے حضرت مجدد الف ثانی کے رسالہ ''رد روافض'' پر بعض حواشی تحریر کیے تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے جب ان حواشی کا قلمی نسخہ دیکھا تو اپنے والد ماجد سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے حواشی پر اختلافی حواشی تحریر کیے اور حضرت مجدد کا دفاع کیا۔ (تفصیل ملاحظہ ہو: Zubaid Ahmad, Contribution of Indo-Pakistan to Arabic Literature, pp:115-116) اس کتاب کا اصل عربی متن مولانا ابوالحسن زید فاروقی کی تصحیح سے دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

[۶۲] یہ کتاب سیماب اکبر آبادی کے اردو ترجمہ کے ساتھ فخر المطابع (لکھنؤ) سے ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء میں طبع ہوئی۔

[۶۳] یہ دراصل ''میزان البلاغت'' کی شرح ہے جو مولانا ارتضیٰ علی خاں نے کی تھی اور دائرۃ المعارف (دکن) سے ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں طبع ہوئی۔

[۶۴] اس رسالہ کی علامہ محمود شکری آلوسی نے ''سعادۃ الدارین'' کے نام سے شرح لکھی تھی جو بیروت اور پشاور سے طبع ہو چکی ہے۔

[۶۵] یہ رسالہ اردو ترجمہ کے ساتھ مطبع عزیزی المعروف مطبع احمدی سے ۱۳۱۰ھ/۱۹۱۴ء میں مجموعہ رسائل خمسہ

۲۵۔ رسالہ تحقیق الرویاء (فارسی)[۶۶]

۲۶۔ رسالہ اصول مذہب حنفی (فارسی)[۶۷]

۲۷۔ حاشیہ علی القول الجمیل (فارسی)[۶۸]

۲۸۔ حاشیہ شرح شمسیہ (فارسی)[۶۹]

۲۹۔ حاشیہ صدرا (فارسی)[۷۰]

۳۰۔ حاشیہ شرح تہذیب (فارسی)[۷۱]

۳۱۔ حاشیہ شرح ارجوزہ الاصمعی (عربی)[۷۲]

۳۲۔ التضمین علی قصائد وقطعات (عربی)[۷۳]

۳۳۔ شرح علی قصیدۃ البردۃ (عربی)[۷۴]

۳۴۔ اعجاز البلاغت (فارسی)[۷۵]

کے ذیل میں شاہ ولی اللہ سے منسوب کر کے شائع کیا گیا۔ شاید اس وجہ سے اسے شاہ ولی اللہ کا رسالہ سمجھا گیا۔ حالانکہ مطبع کے مالک سید ظہیر الدین دہلوی نے سرورق پر لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے رسائل جمع کیے گئے ہیں۔

[۶۶] اس رسالہ کا اردو ترجمہ مطبع احمدی (دہلی) اور مطبع مجتبائی (دہلی) سے طبع ہوا۔ اس طرح روزنامہ اخبار (دہلی) سے ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں بھی طبع ہوا۔ فارسی متن کے مطبوعہ نسخہ کا علم نہیں ہو سکا۔

[۶۷] اس کا ذکر حکیم محمود احمد برکاتی نے ''شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب''، ص ۱۵۳ پر کیا ہے۔

[۶۸] ماخذ سابق، ص ۱۵۲

[۶۹] اس کا ذکر مولانا عبد الحی نے ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند''، مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافۃ، قاہرہ، ص ۳۸۷ پر کیا ہے۔

[۷۰] ماخذ سابق، ص ۳۸۶

[۷۱] ماخذ سابق، ص ۳۸۱

[۷۲] اس کا ذکر ڈاکٹر ثریا ڈار نے شاہ عبدالعزیز اور ان کی علمی خدمات، ص ۲۸۵ پر کیا ہے۔

[۷۳] ماخذ سابق

[۷۴] ماخذ سابق

[۷۵] ماخذ سابق

۳۵۔ فیصلہ شاہ صاحب (فارسی)[۷۶]

۳۶۔ دیوان عربی (عربی)[۷۷]

۳۷۔ سنگیت شاستر (فارسی)[۷۸]

۳۸۔ رسالہ فی تفسیر مااھل بہ لغیر اللہ (فارسی)[۷۹]

۳۹۔ عزۃ الراشدین (فارسی)[۸۰]

۴۰۔ رسالہ سوالات عشرہ شاہ بخارا (فارسی)[۸۱]

۴۱۔ رسالہ بیان مسائل خمسہ (فارسی)[۸۲]

۴۲۔ دلائل اربعہ شیعہ و بیان حدیث الثقلین (فارسی)[۸۳]

---

[۷۶] آپ کا یہ رسالہ مسئلہ وحدت الوجود کے موضوع پر ہے۔ نظامی پریس (بدایوں) سے اس کا فارسی متن شائع ہوا تھا۔ مولانا مشتاق احمد انبیٹھوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔

[۷۷] مولوی عبدالرحیم دہلوی کی روایت کے مطابق شاہ صاحب کا عربی دیوان بھی تھا جو انہوں نے دہلی کے بعض اصحاب کے پاس دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اس کی تفصیل فراہم نہیں کی۔ البتہ ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (لاہور) کے کتب خانے میں اس دیوان کی ایک نقل راقم کی نظر سے گزری ہے۔

[۷۸] اس رسالہ کا قلمی نسخہ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں رضا لائبریری (رام پور) سے ملا ہے۔ اس قلمی نسخہ کے کاتب اور واحد راوی منشی کندن لال اشکی ہیں۔ ڈاکٹر عضد الدین خاں نے معارف (اعظم گڑھ) دسمبر ۱۹۶۴ء میں اس قلمی نسخہ کا تعارف کروایا ہے اور اس کی نسبت شاہ صاحب کی طرف تسلیم کرلی ہے۔ مگر اس رسالہ کے مندرجات آپ کے فتویٰ غنا (مشمولہ فتاویٰ عزیزی) سے متصادم معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم اس پر تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔

[۷۹] اس کا رد عبدالحکیم پنجابی نے لکھا۔ نیز ملاحظہ ہو: اولاد حسن قنوجی، نوائے ادب (بمبئی) اپریل ۱۹۵۳ء

[۸۰] مرزا محمد علی نے اپنی کتاب ''نجوم اسماء'' (لکھنؤ)، ص ۳۵۹ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر شاہ صاحب سے اس کتاب کی نسبت درست نہیں۔ ممکن ہے آپ کے کسی شاگرد نے یہ کتاب تحریر کی ہو۔

[۸۱] یہ رسالہ مطبع فخر الدین (لاہور) سے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں طبع ہوا تھا۔ اسی طرح ''فتاویٰ'' میں بھی شامل ہے۔

[۸۲] یہ رسالہ بھی مطبع فخر الدین (لاہور) سے ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں طبع ہوا اور ''فتاویٰ'' میں بھی شامل ہے۔

[۸۳] یہ رسالہ بھی ''فتاویٰ عزیزیہ'' میں شامل ہے۔

۴۳۔ مسائل متعلقہ حقہ و حرمت نان پاؤ وافیون (عربی/فارسی)[۸۴]

۴۴۔ تقریر دلپذیر فی شرح عدیم النظیر (فارسی)[۸۵]

۴۵۔ رسالہ فی الانساب[۸۶]

۴۶۔ افادات عزیزیہ (عربی/فارسی)[۸۷]

۴۷۔ مختصر فی المعراج (عربی)[۸۸]

۴۸۔ میزان الکلام (فارسی)[۸۹]

۴۹۔ رسالہ در اسئلہ واجوبہ (فارسی)[۹۰]

۵۰۔ الاحادیث الموضوعہ (عربی)

۵۱۔ نظام العقائد (فارسی)

۵۲۔ قرآن السعدین وایضاح النبرین در ذکر شہادت حسین (عربی)

۵۳۔ تضمین قصیدہ شاہ ولی اللہ (عربی)

---

[۸۴] یہ رسالہ مطبع مصطفائی (کانپور) سے ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں طبع ہوا۔ ۸۶ صفحات پر مشتمل اس رسالہ میں بعض دیگر علماء کے بھی متعلقہ موضوع پر فتاویٰ شامل ہیں۔

[۸۵] اس رسالہ کا قلمی نسخہ مولوی نصرت علی سکندر آباد (پٹنہ) کے کتب خانہ میں ہے۔ اس نسخہ کی مدد سے اس کا اردو ترجمہ مولوی فہیم الدین میرٹھی نے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں کیا۔ بروایت تراجم علمائے حدیث ہند، ص ۶۰، اردو ترجمہ کا قلمی نسخہ مولانا عبدالمجید سوہدروی کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اب یہ نسخہ کتب خانہ دارالدعوۃ السلفیہ (لاہور) کے کتب خانہ میں ہے۔ تاہم اس کے کسی مطبوعہ نسخہ کا علم نہیں ہو سکا۔

[۸۶] اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے کتب خانہ میں کتب خانہ نمبر ۲۰۹ کے تحت موجود ہے۔ تاہم یہ رسالہ اب تک غیر مطبوع ہے۔

[۸۷] یہ دراصل مولانا رفیع الدین مرادآبادی کے سوالات کے جوابات ہیں۔ ہنوز غیر مطبوع ہے۔ اس کے قلمی نسخے ندوۃ العلماء (لکھنؤ)، مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) اور مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) میں موجود ہیں۔

[۸۸] اس کا ذکر مولانا نسیم احمد فریدی نے ''مکاتیب شاہ ولی اللہ''، ص ۳۷ میں کیا ہے اور اس کا جامع نامعلوم بتایا ہے۔ اب تک اس کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخہ کا علم نہیں ہو سکا۔

[۸۹] اس کا ذکر مولانا عبدالحی نے ''الثقافۃ اسلامیہ فی الہند''، ص ۲۳۹ میں کیا ہے۔

[۹۰] یہ رسالہ دراصل شاہ صاحب کا رسالہ ''فیض عام'' ہی ہے، جو اس نام سے بھی موجود ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ دارالعلوم (دیوبند) کتب خانہ نمبر ۶۹/۲ دریافت ہو سکا ہے۔

۵۴۔رسالہ احکام حج (فارسی)

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرح کتب کا کافی بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ان کتب میں اکثر تو طبع ہو چکی ہیں لیکن کئی ایسی ہیں جن کی طباعت ایک بار سے زیادہ نہیں ہو سکی۔ جبکہ بڑا حصہ کتب کا ایسا ہے جو غیر مطبوع ہے۔

- شاہ عبدالعزیز کی کتب کے قلمی نسخوں اور قدیم اشاعتوں کو سامنے رکھ کر متن کی تحقیق کے ساتھ شائع کرنے کی ضرورت ہے۔
- اسی طرح شاہ صاحب کی وہ کتب جو اب تک شائع نہیں ہو سکیں ان کو تلاش کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔
- شاہ صاحب نے چونکہ اپنے والد ماجد کے فلسفے کو عوامی سطح پر منتقل کرنے کے لیے اس دور کی عوامی زبان فارسی کو استعمال کیا، ضرورت ہے کہ ان کتب کو برصغیر کی مروجہ زبان اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ شاہ صاحب کے مقصد تالیف کی تکمیل ہو سکے۔
- اسی طرح وہ کتب، رسائل اور عبارات جو شاہ صاحب سے غلط طور پر منسوب کی جاتی ہیں ان کا جائزہ لے کر حقائق سامنے لانے کی بھی ضرورت ہے۔[۹۱]

[۹۱] ایک کتاب ''بشارت احمدی'' ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی، جس کے مولف عبدالعزیز محدث لکھنوی تھے۔ لیکن اسے شاہ صاحب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ دوسری ''راہ نجات'' ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء کی نسبت بھی آپ کی طرف کی جاتی ہے۔ان دونوں کتب کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد۔دکن) میں موجود ہیں۔اسی طرح ''عزۃ الراشدین'' کی نسبت بھی آپ کی طرف کی جاتی ہے جو شاید درست نہیں۔ نیز ایک اور کتاب سنگیت شاستر کی نسبت بھی آپ کی طرف کی جاتی ہے۔اگرچہ شاہ صاحب فن موسیقی کے ماہر تھے لیکن موسیقی کے حوالے سے آپ کا فتویٰ حرمت کا تھا۔ اس لیے اس پر بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔اسی طرح ''کرامات الاولیا'' (قلمی نسخے رضا لائبریری، (رام پور) و آزاد لائبریری، (علی گڑھ) کی نسبت بھی آپ کی طرف کی جاتی ہے۔ مگر اس کی شہادت کے حوالے سے تاریخی مآخذ خاموش ہیں۔

ادبیات عربی کی تاریخ نویسی

ڈاکٹر محمد شاکر رضا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
shakir.efl@gmail.com

عربی ادب کی تاریخ سے مراد عربی زبان وادب کا ارتقا اور اس کے مختلف ادوار اور زمانوں کی تاریخ ہے جس میں اس زبان کے نامور شعرا و ادبا کا تذکرہ اور ان کے ادبی شہ پاروں کو بیان کیا جاتا ہے، عربی ادب کی تاریخ میں اس کی ترقی اور تنزلی کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کبھی کبھی عربی ادب کا استعمال وسیع مفہوم میں بھی کیا جاتا ہے جس میں عربی و اسلامی تراث کا تذکرہ ہوتا ہے (اس مقالہ میں عربی ادب سے اس کا وسیع مفہوم مراد نہیں ہے)۔ عربی اور اسلامی قوموں کی سیاسی اور سماجی ترقی و تنزلی کے اعتبار سے عربی ادب کی تاریخ کو درج ذیل پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

۱. **دور جاہلی:** یہ دور پانچویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے جب عدنانیوں نے یمنیوں سے خود مختاری حاصل کی اور ۶۲۲ء میں آغاز اسلام پر یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔
۲. **آغاز اسلام تا عہد بنی امیہ:** یہ دور اسلام کے آغاز یعنی بعثت نبوی سے شروع ہو کر ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء میں عباسی حکومت کے قیام پر ختم ہو جاتا ہے۔
۳. **دور عباسی:** یہ دور عباسیوں کی حکومت کے قیام سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد پر ختم ہوتا ہے۔ مؤرخین نے عصر عبّاسی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے - پہلے دور کو عصر عبّاسی اول کہا جاتا ہے، اسے عصر عبّاسی کا سنہرا دور کہا جاتا ہے اس دور کے عبّاسی خلفاء نے بے شمار علمی ادبی اور فتوحاتی کارنامے انجام دیے۔ یہ دور ۱۳۲ھ / ۷۵۰ء سے شروع ہو کر ۲۳۲ھ / ۸۴۷ء پر ختم ہوتا ہے، اس دور کے بعض نامور خلفاء ابو العباس سفّاح، ابو جعفر منصور، ہارون رشید، اور مامون رشید ہوئے - دوسرے دور کو عصر عبّاسی ثانی کہا جاتا ہے جس کی شروعات ۲۳۲ھ / ۸۴۷ء سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام خلافت عبّاسی کے زوال ۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء پر ہوتا ہے، عصر عبّاسی کے دوسرے دور کو علمی ادبی اور حکومتی لحاظ سے زوال اور انحطاط کا دور کہا جاتا ہے -
۴. **دور ترکی:** تاتاریوں کے ہاتھوں سقوط بغداد پر اس دور کی ابتدا اور ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں عصر

النہضۃ یا انقلابی تحریک کے شروع ہونے پر اس کی انتہا ہوتی ہے۔

۵. دور حاضر: ۱۸۰۵ء میں محمد علی پاشا کے مصر پر حاکم ہونے سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اب تک یہی دور جاری ہے۔

دوسرے علوم وفنون کی طرح زبان وادب کی تاریخ نویسی میں بھی عربوں کو دوسری قوموں پر سبقت اور اولیت حاصل ہے، انگریزوں کے یہاں اس کی ابتدا عصر حاضر سے ذرا پہلے ہوتی ہے جب کہ عرب علما اور اسکالروں نے اس پر بہت پہلے کام شروع کر دیا تھا۔ مشہور شعرا اور ادبا کی سوانح پر جو کتابیں اسلامی دور میں تصنیف کی گئیں ان میں ان شخصیات کی زندگی پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کی کتابوں اور دواوین کا ذکر ہوتا، ان کتابوں کے موضوعات پر گفتگو کی جاتی اور بسا اوقات فنی قدر وقیمت کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی کی جاتی، یہ اسلوب شیخ ابو محمد احمد طیفور بغدادی (متوفی ۲۸۰ھ) کی کتاب "أخبار المؤلفين والمؤلفات" اور مشہور مؤرخ ابوالفرج اصفہانی (۲۸۴-۳۵۶ھ) کی "كتاب الأغاني" کے علاوہ دوسری تصنیفات میں بھی نظر آتا ہے۔ سب سے پہلی کتاب جس میں مصنفین اور تصنیفات پر باقاعدہ گفتگو کی گئی وہ ابن ندیم (متوفی ۳۸۵ھ) کی کتاب "الفہرست" ہے، جس میں عربی زبان کے آغاز سے مصنف کے زمانے تک مختلف علوم وفنون پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں تھیں اُن سب کا احاطہ کیا گیا ہے، اس کتاب کے مصنف نے خالص عربوں کی تالیف وتصنیف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس زمانے تک جو بھی عربی واسلامی علوم وفنون ایجاد کیے گئے یا وہ دوسری زبانوں سے منتقل ہو کر عربی زبان میں آئے ان تمام کو اس کتاب میں شامل کیا ہے، اس کے علاوہ ان مصنفین، شعرا وادبا کی سوانح، قدر وقیمت کے اعتبار سے ان کی درجہ بندی اور ان کے شہروں پر بھی گفتگو کی گئی ہے، اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو بہت ساری نایاب کتابوں کے نام ضائع ہو گئے ہوتے اور بہت سارے علما، شعرا اور ادبا کی سوانح سے ہم محروم رہ جاتے، گویا یہ کتاب علم وادب کا ایک ذخیرہ ہے۔

اس موضوع پر دوسری اہم کتاب طاش کبریٰ زادہ (متوفی ۹۶۸ھ) کی "مفتاح السعادة ومصباح السيادة في موضوعات العلوم" ہے۔ طاش کبریٰ زادہ عہد عثمانی کے عظیم ترین مصنفین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور ان میں ڈیڑھ سو علوم وفنون کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں علم، فضیلت علما، آغاز سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے مختلف علوم وفنون جیسے علم حیوانات، نباتات، طب، ہندسہ، فلکیات، سیاسیات، رسم الخط، بلاغت، الٰہیات وغیرہ، ان علوم وفنون کے ماہرین، موجدین، مصنفین اور ان کے شہروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں اسلامی علوم وفنون:

فقہ، حدیث، اصول، تفسیر، عقیدہ، فلسفہ وغیرہ، ان علوم وفنون کے ماہرین، موجدین اور مصنفین پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تیسری جلد میں ان علوم وفنون کی روح یعنی تصوف پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب علما اور اسکالرس کے لیے بے حد اہم اور مفید شمار کی جاتی ہے۔ اس موضوع پر حاجی خلیفہ (متوفی ۱۰۶۷ھ) کی کتاب "كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون" کو معلومات کا خزانہ اور گزشتہ کتابوں کے لیے تصدیق نامہ کہا جاتا ہے جس میں آغاز سے سترہویں صدی کے نصف تک سات ضخیم جلدوں پر مشتمل عربی واسلامی علوم وفنون کی تقریباً بیس ہزار کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، کتاب میں ابجدی ترتیب کا خیال رکھا گیا ہے تاکہ تکرار اور التباس نہ ہو اور مطلوبہ مقام تک آسانی کے ساتھ رسائی ہو سکے۔ جب بھی کسی کتاب کا ذکر کیا گیا تو اس کے ساتھ مصنف کے احوال، تاریخ وفات، کتاب کی تفصیل وتبویب، اس کی قدر وقیمت، اس پر لکھے گئے شروح وحواشی اور دیگر تفصیلات بھی بیان کر دی گئیں ہیں، کشف الظنون کی اہمیت کے پیش نظر مختلف علما اور اسکالروں نے اس پر حواشی لکھے جن میں بعد میں لکھی گئیں کتابوں کی تفصیلات کا اضافہ کیا گیا، ان میں اسماعیل پاشا بغدادی کی إيضاح المكنون في الذيل على كشف الظنون بے حد اہم شمار کی جاتی ہے۔ عربی زبان وادب کی تاریخ پر کشف الظنون کو انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا ہے جو بالکل بجا ہے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کا مقدمہ، ابن اَنباری (متوفی ۵۷۷ھ) کی طبقات الأدباء، ابن خلّکان (متوفی ۶۸۱ھ) کی وَفیات الأعیان، ابن شاکر الکتبی (متوفی ۷۶۴ھ) کی فوات الوَفیاّت، اسماعیل پاشا بغدادی (متوفی ۱۳۹۹ھ) کی ہدیۃ العارفین أسماء المؤلفین وآثار المصنفین بھی عربی زبان وادب کی تاریخ پر مصادر ومراجع شمار کی جاتی ہیں۔

عربی زبان کی تاریخ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، ہر محقق اس بحر پیکراں میں ڈوب کر موتیاں نکال سکتا ہے، اس میدان میں بے شمار علما اور اسکالروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ دور حاضر میں عربی زبان وادب کی تاریخ پر جن اصحاب علم وفضل نے کتابیں تحریر کی ہیں ان میں جرمن مستشرق کارل بروکلمان (C. Brockelmmann)، جُرجی زیدان، مصطفی صادق رافعی، طٰہٰ حسین، محمود مصطفی، عمر دسوقی، عُمر فَرّوخ، حنّا فاخوری، احمد حسن زیّات، اور شوقی ضیف کافی مشہور ہوئے۔

کارل بروکلمان (۱۸۶۸-۱۹۵۶ء) کی پیدائش جرمنی کے شہر روستک میں ہوئی انہوں نے ۱۸۹۰ء میں سٹراسبرگ یونیورسٹی سے "ابن اثیر کی کتاب الکامل اور تاریخ طبری کے درمیان تعلقات" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، یوروپ کی جامعات میں کارل بروکلمان کو سامی علوم

وفنون اور تاریخ تراث عربی میں بیسویں صدی کے نصف اول کا سرخیل اور امام تصور کیا جاتا ہے، انہیں عربی کے علاوہ یونانی، لاطینی، عبرانی، سریانی، ترکی اور فارسی زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی، انہوں نے عربی زبان وادب کا مطالعہ اسکول کے زمانے سے ہی شروع کردیا تھا، بروکلمان نے عربی واسلامی علوم وفنون پر متعدد کتابیں لکھیں، لیکن جس کتاب کی وجہ سے انہیں شہرت دوام ملی وہ "تاریخ الأدب العربی" ہے، اصلاً یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، اس عظیم علمی و اسلامی امانت کو ڈاکٹر عبدالحلیم نجار، یعقوب بکر اور رمضان عبدالتواب نے عرب لیگ کی مالی اعانت سے عربی زبان میں چھ ضخیم جلدوں میں منتقل کیا، اس کتاب میں مشہور مصنفین اور مشرق ومغرب میں منتشر مختلف عربی واسلامی علوم وفنون کی کتابیں، مخطوطات، شروح وحواشی اور دیگر تفصیلات بیان کی گئیں ہیں۔

عرب علما واسکالروں نے عربی ادب کی تاریخ پر اس سے پہلے جو کتابیں لکھیں ان کا مقصد تعلیمی ہوا کرتا تھا۔ ابن ندیم کی الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور اس موضوع پر دیگر کتابیں ادبی ذوق و استعداد کو پروان چڑھانے میں معاون تھیں، لیکن مسلمانوں کی علمی، ادبی اور فکری میراث کی تحقیق وتنقید یا تحلیل وتجزیہ سے یہ کتابیں خالی تھیں، ان میں تاریخی تفصیلات، نحوی و فقہی مدارس کا پرزور بیان، شعرا کے ادبی معرکے اور ادبا و شعرا کے درمیان موازنہ ومقابلہ کی طویل داستان تو ملتی ہے لیکن اس بات کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے کہ عربی واسلامی ادب نے علوم وفنون کی ترقی میں کیا رول ادا کیا، یا اس نے تہذیب وتمدن کے حوالے سے دنیا کو کیا دیا، یا حق اور بھلائی کی طرف انسانوں کی رہنمائی کرنے میں اس کا کیا حصہ رہا، مترجم کتاب ڈاکٹر عبدالحلیم النجار کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> عربی زبان کا قاری جب بھی عربوں کے علوم وفنون کو تلاش کرتا، یا یہ جاننے کی کوشش کرتا کہ عربی زبان نے سائنسی علوم وفنون میں کیا خدمات انجام دی ہے، یا دنیا کی تہذیب وتمدن کی ترقی میں اس کا کیا رول رہا ہے، یا وہ دنیا کے کتب خانوں میں عربوں کے بکھرے ہوئے علمی وفکری ورثہ کو اس غرض سے احاطہ کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ انہیں آیات بیّنات سمجھ کر ان پر فخر ومباہات کرسکے یا انہیں اپنی حیات وبقا کے لیے ذریعہ اور وسیلہ سمجھے، یا کم از کم یہ معلوم کرسکے کہ اس لازوال میراث سے دنیا کی زبانوں میں کیا ترجمہ ہوا ہے، اس پر کیا تحقیقی کام ہوئے ہیں جن کی وجہ سے علم وادب کو مشرق ومغرب میں ترقی ملی۔ تو (قاری) کی دلی تمنا ہوتی کہ کاش عربی ادب

کی تاریخ پر کارل بروکلمان کی کتاب عربی زبان میں ہوتی۔ یہ وہ اہم مقاصد ہیں جن پر عربی ادب کی تاریخ لکھتے وقت کارل بروکلمان کی نگاہیں تھیں[1]۔

یہ اقتباس اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کارل بروکلمان نے جس وقت عربی ادب کی تاریخ لکھی اس وقت اس موضوع پر اس طرز کی کوئی کتاب نہیں تھی۔ لہٰذا بروکلمان کو اس زاویے سے ادب عربی کی تاریخ کے فن کا موجد اور مؤسس کہا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے عرب مصنفین کے اسلوب کے برخلاف عربوں کی میراث کو عقلی، فکری، علمی اور ادبی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے، اس کے بعد مشرق و مغرب میں جب بھی عربی ادب کی تاریخ لکھی گئی تو اس کتاب کے منہج کو نظرانداز نہ کیا جاسکا اور عربی ادب کی تاریخ کی تمام کتابیں اسی نہج پر لکھی گئیں۔ اس کتاب میں بروکلمان نے عربی ادب کے مختلف ادوار و اماکن اور ان میں مختلف علوم و فنون کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے جو عربی ادب کے آغاز سے عصر حاضر تک کو شامل ہے۔ یہ کتاب عربی اور اسلامی مطالعات کے حوالے سے انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی جلد میں ماضی میں تاریخ ادب پر لکھی گئی کتابوں، ان کے مناہج اور مصنفین کا تذکرہ ہے۔ دوسری جلد میں ۷۵۰ سے ۱۰۰۰ صدی عیسوی کے درمیان برپا ہونے والے عرب انقلاب کو بیان کیا گیا ہے، جس میں دور عباسی میں بغداد، جزیرۃ العرب، شام اور مصر کے شعرا کا تذکرہ ہے، اس کے بعد مصنف نے نثری کاوشات کا ذکر کرتے ہوئے کوفہ، بصرہ، بغداد، ایران اور مشرقی ممالک میں عربی علوم و فنون کے ارتقا اور ان کے مختلف مدارس و مناہج پر گفتگو کی ہے۔ تیسری جلد میں تاریخ کی ابتدا، حدیث اور علوم حدیث، فقہ اور فقہی مسالک کا بیان ہے۔ چوتھی جلد میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ادب و ثقافت اور علوم و فنون نے قرآن کریم سے کس طرح استفادہ کیا، اس کے علاوہ فقہ، تفسیر قرآن، عقائد، تصوف، فلسفہ، ریاضی، علم الافلاک، جغرافیہ، طب اور سائنسی علوم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں جلد میں ۱۰۱۰ سے ۱۲۵۸ کے درمیان فروغ پانے والے اسلامی ادب پر گفتگو کی گئی ہے جس میں مختلف ابواب کے ضمن میں شاعری، نثر، بلاغت اور لسانیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹی اور آخری جلد میں بروکلمان نے ملکوں، شہروں، شخصیتوں اور نبیوں کی تاریخ پر گفتگو کی ہے۔ اس طویل سفر میں بروکلمان نے کہیں کہیں لغزشیں بھی کھائی ہیں جن کی طرف عرب علما و اسکالروں نے نہ صرف نشاندہی کی بلکہ

---

[1] تاریخ الأدب العربي — کارل بروکلمان، مترجم: ڈاکٹر عبد الحلیم النجار، کلمۃ المترجم، طبع خامس، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۵۹، جلد اول، ص ط۔

ان کی تصحیح و تصویب کا کام بھی کیا، لیکن اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ دنیا کے کتب خانوں میں تراث عربی واسلامی کے جو مخطوطے روپوش تھے ان کا بروکلمان نے پہلی بار تعارف پیش کر کے تنہا وہ کام کر دکھایا جو اس وقت کے بہت سارے حکومتی اور غیر حکومتی ادارے بھی نہ کر سکے۔

عصر حاضر میں عربی زبان وادب کے کارواں کو آگے بڑھانے میں جن شخصیتوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں جُرجی زیدان (۱۸۶۱-۱۹۱۴) کا نام بھی شامل ہے۔ جرجی زیدان کو ایک مشہور ادیب، ناول نگار، مؤرخ اور بطور صحافی کے جانا جاتا ہے، جرجی زیدان کی پیدائش بیروت کے ایک خستہ حال گھرانے میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد طب کی طرف ان کا رجحان ہوا، پھر انہوں نے مصر کا سفر کیا اور طب کو چھوڑ کر ادب، تاریخ اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ جرجی زیدان کو عربی، انگلش اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت تھی، اسلامی اور عربی ادب سے انہیں خاص شغف تھا۔ تاریخ پر مختلف کتابیں لکھنے کے بعد انہوں نے ۱۸۹۲ میں الہلال کے نام سے ایک عربی رسالے کا آغاز کیا جس میں بڑے بڑے ادیبوں نے قلمی طور پر حصہ لیا، خود جرجی زیدان نے اپنے علمی کاموں کو سب سے پہلے الہلال میں قسط وار شائع کیا، الہلال اپنے وقت کا بے حد مقبول رسالہ ثابت ہوا، اس کی اشاعت کو سو سال سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں مگر ابھی تک وہ اسی آب وتاب کے ساتھ جاری ہے[۲]۔

جرجی زیدان نے کارل بروکلمان کے طرز پر "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" کے نام سے ادبیات عربی کی تاریخ لکھی۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں تین سو ساٹھ صفحات ہیں جن میں دور جاہلی، آغاز اسلام اور اموی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز تمہیدی مقدمے سے ہوتا ہے جس میں زبان کے آداب، مصادر ادب، یونانی ادب اور اسلام سے قبل عربوں کے آداب کا تذکرہ ہے، جاہلی دور کے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے جاہلی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، آغاز اسلام کے دور میں عربوں کے آداب، شاعری اور خطابت میں کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں، شاعری کے حوالے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا کیا موقف تھا، علوم وفنون میں کیا ترقی ہوئی، ان سب چیزوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ اموی دور میں اس زمانے کی خصوصیات، ادب میں ان کے اثرات، خطابت، خطبا اور انشا پردازی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی دوسری جلد چار سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں عصر عباسی کے

---

[۲] مزید تفصیل کے لئے میرا مضمون: ''جرجی زیدان کی تصانیف کا مختصر تجزیاتی مطالعہ'' ملاحظہ کریں جو ماہنامہ معارف کے مارچ ۲۰۲۱ کے شمارہ میں شائع ہوا۔

آغاز یعنی ۱۳۲ ہجری سے اس کے اختتام یعنی ۶۵۶ ہجری کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے، عصر عباسی کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر دور کی سیاسی اور سماجی خصوصیتوں کو بیان کرتے ہوئے اُن ادوار کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسری جلد بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے مگر یہ باقی جلدوں سے اس اعتبار سے الگ ہے کہ اس میں بے شمار علمی وادبی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اس جلد میں مصنف نے عباسیوں کے چوتھے دور کے علوم وفنون کے علاوہ مغولی اور عثمانی دور کے علوم وفنون پر بھی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ چوتھی اور آخری جلد بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں دور حاضر کے عربی ادب کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" کو علمی حلقوں میں ادبیات عربی کے حوالے سے بڑی پذیرائی ملی، یہ کتاب ادبیات عربی کے میدان میں معلومات کا ایک خزانہ ہے کیوں کہ مصنف نے اس کتاب کے ذریعے عربی زبان و ادب کے شہروں ، زمانوں ، شخصیتوں ، امتیازی خصوصیتوں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے اور عربی زبان و ادب کے شائقین اور اسکالروں کو نئی دنیا سے متعارف کیا ہے۔

احمد حسن زیات بیسویں صدی میں عربی زبان وادب کے حوالے سے بہت معروف نام ہے، آپ کی پیدائش مصر کے شہر طنطا کے ایک گاؤں کَفرِ دمیرہ القدیم میں ۱۸۸۵ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳ سال کی عمر میں جامع ازہر میں داخل ہوئے اور وہاں دس سال رہ کر مختلف علوم وفنون سے بہرہ ور ہوئے، اس کے بعد آپ درس وتدریس میں مشغول ہوگئے، مختلف مدارس و جامعات میں آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں، تین سال آپ نے بغداد میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں، پھر قاہرہ لوٹ آئے اور "الرسالہ" کے نام سے ایک ماہنامہ شروع کیا جس کی اشاعت ۱۹۳۳ سے ۱۹۵۳ تک رہی، علمی حلقوں میں یہ رسالہ کافی مقبول رہا۔ مختلف اکیڈمیوں اور علمی اداروں کے آپ معزز رکن رہے، ان میں مجمع اللغۃ العربیۃ (قاہرہ)، المجلس الأعلی للآداب والفنون، المجمع العلمی العربی (دمشق)، المجمع العلمی (بغداد)، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر (مصر) سرفہرست ہیں۔ آپ کے علمی کارناموں کی بنیاد پر حکومت کی جانب سے ۱۹۶۲ میں آپ کو مصر کے سب سے بڑے ایوارڈ "جائزۃ الدولۃ التقدیریۃ" سے نوازا گیا۔ قاہرہ میں ۱۹۶۸ میں ۸۳ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ تاریخ الأدب العربی، دفاع عن البلاغۃ ، وحی الرسالۃ، فی اصول الآدب، فِی ضوء الرسالۃ آپ کی مشہور تصنیفات ہیں۔ فرانسیسی میں گوئٹے (Goethe 1832-1749) کے مشہور ناول The Sorrow of young werther اور لامرتین (Lamartine 1746-1683) کے مشہور ناول "رفائیل" کا آپ نے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

مشہور ہنگیرین مستشرق عبدالکریم (۱۸۸۴-۱۹۷۹ء) نے ان کے ترجمے کی تعریف میں کہاہے کہ "یہ ترجمہ اپنی اصل سے زیادہ بہتر ہے"۔

احمد حسن زیّات عربی زبان وادب میں عصر حاضر میں نثر نگاری کے امام تصور کیے جاتے ہیں، زیّات عصر حاضر کے ان چار نامور اشخاص میں سے ایک ہیں جنھیں ان کے خاص اسلوب کی وجہ سے جدید عربی ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے، ان کے نام یہ ہیں: مصطفی صادق رافعی، طٰہٰ حسین، محمود عقّاد اور احمد حسن زیات۔ زیات کا اسلوب بے حد آسان اور واضح ہوتا ہے، ان کے بعض معاصرین نے تو یہ بھی دعوی کیاہے کہ زیات کا اسلوب عربی زبان میں بیسویں صدی کے مشاہیر مصطفی صادق رافعی کے اسلوب سے زیادہ واضح، محمود عقاد کے اسلوب سے زیادہ آسان اور طٰہٰ حسین کے اسلوب سے زیادہ مختصر ہوتا ہے۔ احمد حسن زیات نے اپنی تحریروں میں ادبی، تنقیدی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی زاویوں سے گفتگو کی ہے، انھوں نے اقطاعیت، مطلق العنانی اور جاگیر دارانہ نظام پر کھل کر تنقید کرتے ہوئے جمہوریت کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے، آپ نے نام نہاد پارلیمنٹری کونسلوں کی بھی مذمت کی، اور عوام کو آزادی کے لیے بیدار کیا، مستشرقین کے اس زعم کا بھی رد کیاہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت یونانی تہذیب و ثقافت سے ماخوذ ہے، آپ نے ان دعوؤں کو بھی باطل قرار دیا جس میں کہا گیاہے کہ مصر کی قوم دراصل فرعونی قوم ہے اور انہیں عرب سے خود کو الگ سمجھنا چاہئے۔ ادبی، تنقیدی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات پر اُن کے یہ مقالے اُن کی مشہور کتاب "وحی الرسالہ" میں یکجا کر دیے گئے ہیں[۳]۔

احمد حسن زیات نے تاریخ الأدب العربی کے نام سے عربی ادب کی تاریخ ۱۹۱۶ء میں لکھی، اس وقت تک یہ موضوع لوگوں کے درمیان اس قدر شائع اور مشہور نہیں تھا۔ بنیادی طور پر انھوں نے یہ کتاب انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لیے تصنیف کیا تھا، اس کے پہلے ایڈیشن میں خود مصنف نے کتاب کا ہدف بیان کرتے ہوئے لکھا تھا: "ہم نے اس کتاب کو ادب کے اساتذہ وماہرین کے لیے نہیں بلکہ نونہالوں کے لیے لکھاہے، اور تفاصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی ہے"[۴]۔

مصنف نے اپنی کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیاہے، ابواب سے قبل ایک مقدمہ کا اضافہ بھی ہے۔ مقدمہ میں ادب اور تاریخ ادب کی تعریف کی گئی ہے۔ ادب کی یوں تعریف کی گئی ہے: کسی زبان

---

[۳] تفصیل کے لئے دیکھیں: قمم أدبية، نعمات أحمد فؤاد، عالم الکتب، قاہرۃ، ۱۹۸۴.

[۴] تاریخ الأدب العربي- أحمد حسن زیات، دار نهضة مصر، قاہرہ، ب.ت. ص ۳۔

کے شعرا و مصنفین کا وہ کلام، جس میں نازک خیالات و جذبات کی عکاسی اور باریک معانی و مطالب کی ترجمانی کی گئی ہو، اس زبان کا ادب کہلاتا ہے، اور تاریخ ادب کی یوں تعریف کی گئی ہے: ’’کوئی زبان کتنے متفرق ادوار سے گزری، مختلف زمانوں میں اسے ادبا و شعرا نے کس قدر نظم و نثر کا ذخیرہ دیا اور وہ کون سے اسباب تھے جو اس کی ترقی یا تنزلی اور تباہی کے باعث بنے، یہی وہ علمی مباحث ہیں جنھیں ہم اس زبان کے ادب کی تاریخ کہتے ہیں‘‘۔ مقدمہ ہی میں عرب کی بود و باش، ان کے طبقات، مشہور قبائل اور زمانہ جاہلیت میں عربوں کی سماجی، سیاسی، دینی اور عقلی احوال پر گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے باب کو مصنف نے عصر جاہلی کے لیے مختص کیا ہے، اس میں عربی زبان کے آغاز، نثر کی قسمیں، زمانہ جاہلیت کے مشہور مقررین، شعر کے انواع و اصناف اور ان کی خصوصیات، شعرا کے طبقات اور ان کی شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں آغاز اسلام اور عہد بنی امیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں ادب اسلامی کے مصادر و مراجع، شعرا کے طبقات اور تقریر و ادب کے نمونے پر گفتگو ہے۔ تیسرے باب میں عصر عباسی کا احاطہ کیا گیا ہے، اس میں عصر عباسی میں عربی زبان کے ارتقا، نثر و انشاپردازی، شعر میں اس دور کی ثقافت و تمدن کے اثرات، شعری نمونے، شعرائے مولدین، شعرائے اندلس، عہد فاطمی میں مصری علوم و فنون، شعر و ادب، علوم شرعیہ، علوم عقلیہ، قصے کہانیاں اور عربی مقامات کا بیان ہے۔ چوتھے باب میں سقوط بغداد کے بعد ترکی دور اور اس زمانے کے مشہور شعرا و مصنفین کا تذکرہ ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں عربی ادب کے نشاۃ ثانیہ اور اس کے وسائل و ذرائع، اس دور کے مشہور مصنفین، ادبا اور مقررین کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں مشکل و نامونوس الفاظ و تراکیب کے معانی و مطالب بھی بیان کر دیے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ ادب عربی کے طالب علموں کے لیے بے حد مفید ہے، اِس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب مصر، عراق، شام اور ہندوپاک کی مختلف جامعات و کالجز میں داخل نصاب ہے اور اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مصنفِ کتاب کی وفات یعنی ۱۹۶۸ء تک ہے یہ کتاب ۲۳ مرتبہ چھپ چکی تھی۔ ہر ایڈیشن کو مصنف نے پہلے سے بہتر بنانے کے لیے حذف و اضافہ سے کام لیا ہے۔

عمر فرّوخ (۱۹۰۶-۱۹۸۷ء) عربی زبان کے مشہور ادیب، مفکر، مؤرخ اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کی پیدائش لبنان کے ایک علمی گھرانے میں ہوئی، ان کے والدین کے علاوہ اس گھر کے دوسرے افراد بھی تعلیم یافتہ تھے، ایسی علمی اور پاکیزہ فضا میں عمر فروخ کی نشو و نما ہوئی، بیروت کے مختلف اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی کا سفر کیا اور فلسفہ

میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس دوران انھوں نے جرمنی کے علاوہ یوروپ کے دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور متعدد قابل اور نامور مستشرقین سے استفادہ کیا۔ عمر فروخ کو عربی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، انگلش، فارسی اور ترکی زبانوں پر بھی ملکہ حاصل تھا، انھیں شروع ہی سے تدریس سے کافی شغف تھا، تدریسی خدمت کو وہ ہر پیشے سے زیادہ عظیم سمجھتے تھے، متعدد معتبر اداروں کی جانب سے پیش کش کے باوجود انہوں نے انتظامی ذمہ داریوں سے ہمیشہ خود کو الگ رکھا، تعلیم کی تکمیل کے بعد زندگی بھر تدریس سے وابستہ رہے، نابلس، بیروت، بغدا، دمشق اور لبنان کی متعدد جامعات اور دیگر تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دیں، تدریسی خدمات کے علاوہ تصنیف وتالیف سے انہیں گہرا لگاؤ تھا، چنانچہ ثقافت، ادب، تاریخ، تعلیم اور فلسفہ کے موضوع پر تقریباً ایک سو کتابیں لکھیں۔ تاریخ الأدب العربی (۶ جلدوں میں)، معالم الأدب العربی فی العصر الحدیث (دو جلدوں میں)، تاریخ العلوم عندالعرب، تاریخ الفکر العربی، التبشیر والاستعمار، عبقریۃ العرب فی العلم والفلسفۃ، الأسرۃ فِی الشرع الإسلامی اور تجدید فِی المسلمین لا الاسلام ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ادبی علوم وفنون اور بلاغت سے حد درجہ شغف اور ان میں دسترس کی وجہ سے عمر فروخ کو عصر حاضر کا جاحظ کہا جاسکتا ہے، دونوں میں ایک اتفاقی مشابہت بھی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ جس وقت جاحظ کا انتقال ہوا تھا تو ان کے سینے پر کتاب رکھی ہوئی تھی اور عمر فروخ نے ۱۹۸۷ء میں جب داعی اجل کو لبیک کہا تو وہ ٹائپ رائٹر پر کچھ لکھ رہے تھے۔

عمر فروخ کی کتاب "تاریخ الأدب العربی" کو علمی اور ادبی دنیا میں بے پناہ مقبولیت ملی، اس کتاب کو سب سے پہلے بیروت کے مشہور پبلشر دار العلم للملایین نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد قدیم ادب یعنی دور جاہلی کے آغاز سے سقوط بنی امیہ پر مشتمل ہے، اس جلد میں مصنف نے دور جاہلی کی شاعری، زبان وادب، سیاسی وادبی خصوصیات، عرب قبیلوں کے مختلف لہجات اور ان کے طبعی وسماجی حالات پر روشنی ڈالی ہے، دور جاہلی کی ادبی جہتوں کی خصوصیات، اس دور میں شاعری کا رواج، اس کی قدر وقیمت، شعرا کی اہمیت، شعر معلقات، شاعری کی خصوصیات اور نثر نگاری پر انھوں نے گفتگو کرتے ہوئے اس دور کے عظیم شعرا اور نثر نگاروں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد مصنف نے آغاز اسلام کا ذکر کرتے ہوئے اس زمانے کی نثر نگاری اور شاعری کے بارے میں گفتگو کی ہے، پھر بنی امیہ کے دور میں شعر اور نثر پر بات کرتے ہوئے مشہور شعرا اور خطبا کی سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسری جلد میں چوتھی صدی ہجری تک عباسیوں کے مختلف ادوار اور ان کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسری جلد میں پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے ترکی حکومت کی تاسیس تک کے ادب کا

ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد بلاد مغرب اور اندلس کے ادب پر مشتمل ہے جس میں فتح اسلامی کے آغاز سے طوائف الملوکی کے اختتام تک کے احوال پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں جلد میں مرابطین اور موحدّین کے زمانے کے ادب پر بات کی گئی ہے۔ چھٹی جلد بلاد مغرب اور اندلسی ادب کے لیے مختص ہے جو ساتویں صدی کے آغاز سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک کے ادب کو شامل کیا ہے، اس جلد میں بلاد مغرب اور اندلس کی ثقافتی زندگی، ان شہروں میں اسلامی تمدن کا ارتقا اور نامور شعرا و ادبا جیسے ابن خلدون، معتمد ابن عباد، ابن زیدون وغیرہ کی حیات اور کارناموں کا بیان ہے۔ مصنف کا اسلوب یہ ہے کہ وہ مختلف ادوار کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور پر گفتگو کرتے ہیں، اس کے بعد اس زمانے کے شعرا وخطبا کا تذکرہ کرتے ہیں، پھر ان کے شعری اور نثری نمونے پیش کرتے ہیں۔ یہی اسلوب تمام جلدوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ آخری جلد کے مقدمہ میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس ادبی، شعری ،تاریخی اور سماجی ذخیرہ کی تالیف کے لیے ہزاروں معلوماتی کارڈ جمع کیے اور مشاہیر ادب کی تاریخ، سیرت، مصادر و مراجع یا دیگر معلومات کے لیے ہر بار انہوں نے ان کارڈوں کی طرف رجوع کیا۔ اس سے اس کتاب کی تصنیف میں انہوں نے جو مشقتیں اٹھائی ہیں اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر حکومت کویت نے ۱۹۸۵ء میں مصنف کو اعزازی سند سے نوازا۔ اسلوب کے اعتبار سے یہ کتاب بے حد دلچسپ اور مواد کے اعتبار سے بے انتہا کارآمد ہے، عربی زبان کے طلبا کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

شوقی ضیف (۱۹۱۰-۲۰۰۵ء) عصر حاضر کے مایہ ناز محقق، ناقد اور ادیب ہیں، آپ نے ادب، بلاغت، نحو، سفر نامہ، نثر و نظم اور تحقیق و تنقید میں گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں، آپ کی متعدد تصنیفات مصر اور دیگر ممالک میں داخل نصاب ہیں، آپ کی بعض تصنیفات کے نام یہ ہیں: الفن ومذاہبہ فی الشعر العربی، الفن ومذاہبہ فی النثر العربی، الأدب العربی المعاصر فی مصر، البحث الأدبی، فی النقد الأدبی، تاریخ الأدب العربی۔ جس کتاب نے شوقی ضیف کو عرب دنیا میں سب سے زیادہ شہرت عطا کی وہ ہے "تاریخ الأدب العربی" جو دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد زمانۂ جاہلیت کے شعر و ادب پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں اسلامی دور کے شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسری جلد عباسیوں کے پہلے دور سے متعلق ہے۔ چوتھی جلد عباسیوں کے دوسرے دور سے بحث کرتی ہے۔ پانچویں جلد میں جزیرۃ العرب، عراق اور ایران میں عربی زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹی جلد شام کے عربی ادب پر مشتمل ہے۔ ساتویں جلد میں مصر میں عربی ادب کی تاریخ اور اس کے ارتقا سے بحث ہے۔

آٹھویں جلد میں اندلسی ادب اور اندلس میں عربی شعر و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، نویں جلد میں لیبیا، تیونس اور صقلیہ کے عربی ادب پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور دسویں جلد جزائر، مراکش، موریتانیا اور سوڈان کے عربی ادب پر روشنی ڈالتی ہے۔ ان میں بعض جلدوں کی درجنوں بار اشاعت ہو چکی ہے۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شوقی ضیف نے معاصر ادب پر بھی لکھا، معاصر ادب پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں شوقی ضیف کی کتاب "الأدب العربي المعاصرفی مصر" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف نے اس کتاب میں جدید عربی ادب کے ارتقا کی تاریخ بیان کی ہے، ۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے سو سالہ شعر و ادب کی تصویر کشی اور معاصر ادب پر اثر انداز ہونے والے مختلف اسباب و عوامل کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، شاعری کا ارتقا و رشعری رجحانات کی منظر کشی کی ہے، یوں ہی اس میں نثر کا ارتقا اور محافظین وجدّت پسند مصنفین کے درمیان ہونے والے معرکوں کا تفصیلی تذکرہ بھی آگیا ہے، ان ادباو شعرا کی کوششوں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے عمدہ اور نفیس ادبی شہ پاروں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، مصنف نے یہ ساری باتیں بڑی گہرائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب ایک عظیم ادبی ذخیرہ اور تاریخی شاہکار بن گئی ہے۔ تین سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اب تک اس کے ایک درجن سے زائد ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں، اسے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل نصاب کیا گیا، ہندوستان میں مسابقاتی امتحانات خصوصاً نیٹ NET اور جے آر ایف JRF کی تیاری کے لیے اسے نہایت معاون اور مفید مانا جاتا ہے۔

صاحب تصانیف کثیرہ حنّا فاخوری (۱۹۱۴-۲۰۱۱ء) عصر حاضر میں عربی زبان و ادب کے عظیم مصنف، مؤرخ، ادیب اور محقق شمار کیے جاتے ہیں، آپ کی پیدائش لبنان کے شہر زحلہ کے ایک عیسائی مشنری گھرانے میں ہوئی، تعلیم سے فراغت کے بعد آپ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، تدریس کے زمانہ سے ہی آپ نے علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا آغاز کیا، آپ نے اردن، تیونس اور مراکش کے علاوہ یوروپ کی متعدد جامعات میں لکچرر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ حنا فاخوری نے اپنی تحریروں کے ذریعے ادب، تنقید، تحقیق اور سوانح پر انمٹ نقوش چھوڑے، انھوں نے تراث اسلامی کی متعدد کتابوں کو ایڈٹ کیا اور متعدد کتابوں پر شروح و حواشی تحریر کیے، زبان، ادب اور فلسفہ پر سو سے زیادہ کتابیں لکھیں جن سے کئی نسلوں نے اپنے علم کی پیاس بجھائی، ان کتابوں میں تاریخ الفلسفۃ العربیۃ، الفخر والحماسۃ، تاریخ الأدب العربی الحدیث اور تاریخ الأدب العربی شامل ہیں۔

حنافاخوری کو عرب دنیامیں جس کتاب کی وجہ سے شہرت ملی وہ ان کی کتاب "تاریخ الأدب العربی" ہے جو ۱۹۵۱ میں شائع ہوئی اور مصنف کے نام کے ساتھ ایسے وابستہ ہوئی کہ جب بھی مصنف کا نام آتا ہے تو ساتھ میں ان کی اس کتاب کا بھی تصور لازمی طور پر ہوتا ہے۔ یہ کتاب اسکالرس، محققین اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے طلبا کے لیے مرجع ومصدر کی حیثیت رکھتی ہے، عرب ملکوں میں اس کتاب کی درجنوں بار اشاعت ہوئی، اس کتاب کو فارسی اور روسی زبانوں میں بھی منتقل کیا گیا۔ کتاب کے مقدمہ میں مصنف لکھتے ہیں: "بہت سارے معزز ساتھیوں اور اداروں کے ذمہ داران کی خواہش پر میں نے اس کتاب کو لکھا، اس کتاب کے لیے میں نے عربی زبان کا طویل عرصہ تک مطالعہ کیا، دس سالوں تک عربی زبان وادب کا تحلیل و تجزیہ کیا، اس کے مستند مصادر و مراجع کو کھنگالا اور اس موضوع پر مشرق ومغرب میں جو کچھ لکھا گیا ان سب کا مطالعہ کیا تا کہ اس موضوع کا حق ادا کیا جا سکے اور عربی ادب کے تراث اور اس کے اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کو پیش کیا جا سکے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ کتاب طلبا کے دل ودماغ کو غذا فراہم کرے، ان کی زندگی کو حیات بخشے اور حکومتی امتحانات کو سر کرنے میں یہ معاون ومددگار ثابت ہو خواہ وہ امتحانات کسی بھی موضوع اور کسی بھی سرزمین سے متعلق ہوں"[۵]۔ حنافاخوری کی کتاب "تاریخ الأدب العربی" ساڑھے گیارہ سو صفحات اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عربوں اور عربی زبان کی ابتدائی حالات، ادب جاہلی اور شعر معلقات کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں عہد خلفائے راشدین اور عہد بنی امیہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس میں عربوں کی زندگی میں اسلام کے اثرات، خلفائے راشدین اور بنی امیہ کے عہد میں شاعری کی اہمیت، شاعری اور نثر نگاری کے اصناف اور اس زمانے کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں عہد عباسی کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس میں ادب عباسی کی شاعری، شاعری میں انقلابی و تجدیدی رجحانات اور نثر نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے، مشہور شعرا اور ادبا کی سوانح اور ان کی خدمات پر گفتگو کی گئی ہے اور عہد عباسی میں علوم وفنون کے فروغ اور ارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس دور میں شعر وادب میں پیدا ہونے والا جمود و تعطل اور اس کے اسباب و عوامل کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں اندلسی ادب کا تذکرہ ہے جس میں فتح اندلس، اندلس کی تہذیب وثقافت، شاعری، شعر موشحات، مشہور ادبا و شعرا اور اندلس میں علوم وفنون کی ترقی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچوے باب میں ترکی دور کا بیان ہے، اس باب میں ترکی ادب میں شاعری، نثر

---

[۵] - تاریخ الأدب العربي - حنافاخوری، ص ۷، المطبعة البولسية، بیروت، ۱۹۵۳ء۔

نگاری اور اس کے علوم وفنون پر گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں موجودہ دور پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں موجودہ دور کا تعارف، اس دور میں عربوں کی بیداری کے اسباب ووسائل، شعری خصوصیات، نثری اصناف اور موجودہ دور کے مشہور شعرا وادبا پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

ہندوستانی مدارس کے درس نظامی میں عربی ادب اور اس کی تاریخ کی تدریس پر بہت کم توجّہ دی گئی، کچھ دہائی پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور بعض دیگر اداروں میں تاریخ ادب عربی کو داخل نصاب کیا گیا، اس مضمون کی تعلیم کے لیے احمد حسن زیات کی کتاب تاریخ الأدب العربی کو منتخب کیا گیا- پھر ندوہ کے اساتذہ نے اس سمت میں پہل کرتے ہوئے عربی ادب کی تاریخ پر عربی زبان میں متعدد مستقل کتابیں تصنیف کیں۔ ندوہ کے سینئر استاذ مولانا واضح رشید ندوی نے "تاریخ الادب العربي العصر الجاهلي" لکھی جو پہلی بار ۱۹۸۹ء میں ندوہ سے شائع ہوئی- یہ کتاب دور جاہلی کے ادب عربی کی تاریخ پر مشتمل ہے، مصنف نے اس کتاب میں عربی ادب کی تاریخ، شعر جاہلی کی روایت وکتابت، دور جاہلی کے شعر میں انتحال کا قضیہ، عرب کے بازاروں میں شعر وشاعری، اس زمانے کے شعراء کی سوانح اور منتخب نصوص پر روشنی ڈالی ہے-اس سلسلے کی دوسری کتاب تاریخ الأدب العربی العصر الإسلامي ہے جسے ندوہ کے سابق ناظم مولانا محمّد رابع ندوی نے تالیف کر کے پہلی بار ندوہ سے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا، اس کتاب میں مصنف نے آغاز اسلام اور دور بنی امیّہ کے عربی ادب پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، انہوں نے دور جاہلی کی ادبی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے دور اسلامی کے ادب پر اس کے اثرات کو بیان کیا ہے، اس طرح انہوں نے اس کتاب میں عربی اور اسلامی زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیا ہے-ان دونوں کتابوں کا اسلوب اور منہج یکساں ہے، دونوں کتابوں کو دار ابن کثیر بیروت نے ایک ہی جلد میں تاریخ الأدب العربي العصر الجاهلي والعصر الإسلامي کے نام سے شائع کیا ہے-مولانا واضح رشید ندوی نے ادب عربی کی تاریخ نویسی کے سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک اور کتاب أعلام الأدب العربي في العصر الحديث تصنیف کی اور اسے ۲۰۰۹ میں دار رشید لکھنؤ سے شائع کیا، یہ کتاب عربی ادب کے دور جدید پر مشتمل ہے، اس میں دور جدید کے پچیس ایسے مشاہیر ادباء کا تعارف ہے جنہوں نے اپنے قلم سے عربی ادب کے ذخیرے میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، کتاب میں دور جدید کے ادب اسلامی پر لکھنے والے ادباء پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے جنہیں عام طور پر تاریخ کی دوسری کتابوں میں نظر انداز کیا گیا، اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے- مصنف نے دور جدید کے عربی ادب پر بھی خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے، طلبا کے استفادہ کے لئے انہوں نے مشہور اسلامی مفکر ڈاکٹر محمّد مصطفی ہدارہ کا ایک گراں قدر اور معلوماتی مضمون

بھی کتاب میں شامل کر دیا ہے جس میں ڈاکٹر محمدّ مصطفیٰ ہدارہ نے معاصر عربی ادب پر نفیس گفتگو کرتے ہوئے مغرب میں پیدا ہونے والی ادبی تحریکات اور معاصر عربی ادب پر ان کے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے مدارس اسلامیہ کے طلبا کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کتاب کو تصنیف کیا ہے، ہندوستان میں لکھی گئی اس کتاب کو جدید عربی ادب کی تاریخ پر ایک گراں قدر اضافہ شمار کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیز اور کالجز میں عرصہ دراز سے عربی ادب اور تاریخ عربی ادب پڑھنے اور پڑھانے کا رواج ہے، اس مضمون کی تعلیم کے لیے عربی کتابوں پر اعتماد کیا جاتا ہے، عربی کی ان کتابوں سے استفادہ کرنا عربی کے اساتذہ اور طلبا کے لیے تو آسان ہے مگر دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طلبا کے لیے ان کتابوں کا سمجھنا اور ان سے استفادہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایسی صورت میں یہ ضرورت پیش آئی کہ عربی ادب کی تاریخ اردو زبان میں لکھی جائے تاکہ اردو داں حضرات جو عربی ادب اور اس کی تاریخ سے شغف رکھتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھا سکیں، چنانچہ اب تک عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر متعدد کتابیں اردو زبان میں لکھی جا چکی ہیں، عربی ادب کی تاریخ کے موضوع پر اردو زبان میں جو کتابیں میرے محدود مطالعہ میں آئیں، ذیل میں مختصراً ان کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو زبان میں عربی ادب کی تاریخ پر مولانا عبدالرحمن طاہر سورتی کی "تاریخ ادب عربی" ایک اہم کتاب ہے جو مصری ادیب احمد حسن زیّات کی مشہور کتاب "تاريخ الأدب العربي" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو مولانا عبدالرحمن طاہر سورتی نے پاکستان سے شائع کیا تھا۔ مولانا عبدالرحمن طاہر سورتی (۱۹۱۹-۱۹۸۷ء) عربی اور اردو کے مشہور عالم اور باکمال مدرس تھے، آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں اور درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان تراجم میں زیر نظر کتاب بے حد مشہور ہوئی اور پاکستان کے کئی مکتبوں سے شائع ہو چکی ہے۔ البتہ یہ ترجمہ عام طور پر دستیاب نہیں تھا، لہٰذا طلبا کی سہولت کے لیے ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی (سابق لکچرر شعبۂ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی) نے اسی ترجمہ کو بنیاد بنا کر اس کتاب کی تلخیص کی ہے، اردو ترجمہ میں چند جدید نثر نگاروں، ادیبوں، خطیبوں اور شعرا کا تذکرہ نہیں تھا، اُن کا ترجمہ طفیل صاحب نے اصل کتاب سے کر کے اس تلخیص میں شامل کر دیا ہے گویا یہ اس ترجمے میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ترجمے کا اسلوب انتہائی واضح اور آسان ہے، ترجمے میں سلاست اور شگفتگی ہے اور یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے عربی ادب کی تاریخ پر انمول کتاب کا یہ بہترین ترجمہ ہے۔ البتہ کچھ باتیں قابل ملاحظہ ہیں جو یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔ عربی کتاب میں جو نصوص، ضرب

الامثال، حکیمانہ باتیں اور اشعار نمونے کے طور پر ذکر کئے تھے ان کا سرے سے ترجمہ ہوا ہی نہیں، جب کہ یہ نمونے عربی زبان کے طالب علموں کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ہیں اور ان نمونوں سے ہی عربی زبان کے ہر دور کے مزاج اور رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ کچھ مقامات پر دیکھا گیا کہ بعضِ الفاظ یا تراکیب کا ترجمہ شامل نہیں ہو سکا، پہلے باب کی پہلی فصل میں زمانۂ جاہلیت کے مشہور مقرر قس بن ساعدہ ایادی کے بارے میں ایک عبارت ہے: هو أسقفُ نجران، وخطيبُ العرب وحكيمُها وحَكَمُها، اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ''یہ نجران کا بڑا پادری اور عرب کا مشہور فلسفی اور پنچ تھا''، اس میں خطیب العرب کا ترجمہ نہیں ہے حالاں کہ اسی صفت کی وجہ سے قس بن ساعدہ ایادی کا ذکر آیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ترجمہ نہایت سہل واضح اور سلیس ہے، مترجم کے اسلوب سے یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ لگتا ہے کہ کسی کہنہ مشق انشا پرداز کی مستقل کتاب ہے، یہی اس ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اردو داں شائقینِ تاریخ و ادب کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، تاریخ ادب عربی میں اس قدر جامع، مختصر اور آسان کتاب اردو زبان میں موجود نہیں ہے جس میں عربی زبان کے آغاز سے دور حاضر تک کے ادبا و شعرا کا جائزہ لیا گیا ہو۔

اس موضوع پر ڈاکٹر سید ابوالفضل (۱۹۱۴-۱۹۶۳ء) سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے ''تاریخ ادبیات عربی'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جسے ۱۹۵۵ء میں پہلی بار ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے شائع کیا، بعد میں یہ کتاب انجمن فیضانِ ادب حیدرآباد سے شائع ہونے لگی، اس کا گیارہواں ایڈیشن میرے پیش نظر ہے جو مارچ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب پونے تین سو صفحات اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں جزیرۃ العرب، عرب قوم اور ادب جاہلی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں آغاز اسلام اور عہد بنی امیہ پر گفتگو ہے، تیسرے باب میں عصر عباسی کا تفصیلی ذکر ہے، چوتھا اور پانچواں باب عصر مغلیہ اور عصر عثمانی پر مشتمل ہے، چھٹے باب میں عصر جدید کا ذکر ہے اور ساتویں باب میں نئے ادب اور جدید ادبی رجحانات کا ایک ہلکا سا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب کو ایک طویل زمانہ تک ادب عربی کی امہات الکتب کا مطالعہ کرنے کے بعد بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھا ہے، عربی ادب کی تاریخ پر انھوں نے بڑے اہم مباحث تحریر کیے ہیں جن سے اساتذہ وطلبا کی ایک بڑی تعداد نے برسوں استفادہ کیا۔ خاص طور سے حیدرآباد میں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، یہاں کے متعدد علمی اداروں میں یہ کتاب شامل نصاب ہے۔

اردو زبان میں ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی کتاب ''عربی ادب کی تاریخ''، اس موضوع پر بے حد اہم مانی

جاتی ہے، انھوں نے اردو داں طبقہ اور عربی زبان وادب کے طلبا واساتذہ کے لیے اس کتاب کو تفصیل کے ساتھ چار جلدوں میں مرتب کرنے کا خاکہ بنا کر کام شروع کیا تھا، جس میں زمانۂ جاہلیت، صدر اسلام، عہد بنی امیہ، عباسیوں کے مختلف ادوار بشمول اندلس، عبوری زمانہ، موجودہ زمانہ اور ہندوستانی عربی زبان و ادب پر تفصیل کے ساتھ لکھنے کا منصوبہ تھا۔اس خاکہ کے مطابق کتاب کی پہلی جلد ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی جس میں زمانۂ جاہلی کے احوال اور اس کے شعر وادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ طلبا، اساتذہ اور اردو داں حلقہ میں اسے بڑی مقبولیت ملی اور قلیل عرصہ میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔دوسری جلد دس سال کے بعد ۱۹۸۹ میں شائع ہوئی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ پر مشتمل ہے، جس میں اس عہد کی امتیازی خصوصیات، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی و تمدنی حالات، اس عہد میں نشوونما پانے والے علوم وفنون، شعر وادب اور ان کے ممتاز فنکاروں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب کی تیسری جلد سن ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی جو عہد بنی امیہ پر مشتمل ہے، اس جلد میں عہد بنی امیہ کے تاریخی احوال، اس عہد کے علمی، ادبی اور فنّی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور تمام اصناف ادب کے فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، زبان و لغت کے ماہرین اور مشاہیر کا مفصل تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔کتاب کی مذکورہ تینوں جلدیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے بارہا شائع ہو چکی ہیں۔تاریخی تسلسل اور کتاب کے بنیادی خاکے کے مطابق اس جلد کے بعد عباسی دور کا تذکرہ ہونا تھا لیکن عہد عباسی کی طوالت اور وقت کی قلت کے باعث مصنف نے عہد عباسی کو چھوڑ کر عربی ادب کے موجودہ زمانہ پر روشنی ڈالی ہے جو اس کتاب کی آخری جلد ہے۔ عربی ادب کی تاریخ پر یہ کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے، کتاب کا اسلوب صاف اور سلیس ہے، اور عربی زبان وادب کے طلبا، اساتذہ اور خصوصاً اردو داں طبقہ کے لیے معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ مگر افسوس کہ بنیادی خاکے کے مطابق اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔عہد عباسی تاریخ اسلام کا عہد زریں ہے اور اس بات کا انتظار کر رہا ہے کہ کوئی باذوق اور باصلاحیت شخص اس عہد کے مختلف ادوار اور ہر دور کے علمی، ادبی اور فنی کارناموں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے اور اس تاریخی تسلسل کو مکمل کرے۔

ڈاکٹر شمس کمال انجم، موجودہ صدر شعبۂ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں کشمیر، نے جدید مصری ادب پر ''جدید عربی ادب''، لکھی جو ''الأدب العربی المعاصر فی مصر'' کا اردو ترجمہ ہے، ''جدید عربی ادب''، تین سو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے ۲۰۱۷ء میں جدید ایڈیشن کے طور پر شائع کیا ہے۔ڈاکٹر شمس کمال انجم نے بڑی محنت اور عرق ریزی

سے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ سے قبل انہوں نے عربی ادب کے مختلف ادوار کی مختصر جھلک بھی پیش کی ہے، کتاب پر عربی اور اردو زبان کے مشاہیر کے تاثرات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب اردو داں طبقہ خصوصاً عربی ادب سے شغف رکھنے والے حضرات کے استفادہ کے لیے لکھا ہے۔ اس کتاب میں جدید مصری ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جو ۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۰ء تک کے سو سالہ شعر وادب کی تصویر کشی اور معاصر ادب پر اثر انداز ہونے والے مختلف اسباب و عوامل پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ہیں، اردو اور عربی دونوں زبانوں پر دسترس کے علاوہ ترجمہ کا ذوق بھی رکھتے ہیں، انہوں نے بے حد دلکش انداز میں ترجمہ کیا ہے، قاری کو کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اصل کتاب نہیں بلکہ اس کا ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ البتہ کہیں کہیں پر فنی اور لسانی تسامحات بھی نظر آئے، مثال کے طور پر محمود تیمور کی سوانح میں ایک عبارت ہے: "ویتصادف أن تشہد مع خادمہا احتفال جمعیۃ العروۃ الوثقی فتتعرف علی فتاۃ ثریۃ من الطبقۃ الأرستقراطیۃ،إذ کانت بنتاً لأحد الباشوات" اس کا ترجمہ یوں درج ہے: (سلوی) ایک دن اپنے خالہ کے ساتھ جمعیۃ العروۃ الوثقی کے جلسے میں حاضر ہوتی ہے، وہاں اونچے طبقے کی ایک لڑکی سے سلوی کی ملاقات ہوتی ہے جو کسی پاشا کی بیٹی تھی، یہاں "اپنے خالہ" کے بجائے "اپنے خادم" کا لفظ زیادہ مناسب ہے۔ اردو ادب کے کتب خانہ میں "جدید عربی ادب" ایک اہم اضافہ اور ڈاکٹر شمس کمال انجم کا قابل تعریف کارنامہ ہے، عمومی طور پر زبان وادب کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اور خاص طور پر عربی زبان وادب سے وابستہ طلبا واساتذہ کے لیے یہ کتاب بے حد مفید ہے۔

ایک دوسری کتاب لاہور سے محمد کاظم نے "عربی ادب کی تاریخ" کے نام سے لکھی جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ایک تمہید اور پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں جاہلی، آغاز اسلام، اموی، عباسی، اندلسی، فاطمی، ترکی اور موجودہ دور کے سیاسی، سماجی اور تمدنی احوال و کوائف، عربی زبان وادب کی اہم شخصیات اور مختلف اصناف ادب پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے یہ کتاب اردو داں حضرات خصوصاً ان لوگوں کے لئے لکھی ہے جو عربی زبان کا علم نہیں رکھتے، مگر عربی ادب کی تاریخ سے انہیں دلچسپی ہے اور اس سے وہ واقف ہونا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب اردو کے کتب خانے میں ایک اہم اضافہ ہے، اس کے عمدہ اسلوب اور قیمتی مواد سے ادب کے شائقین کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔

مصادر و مراجع:

۱-تاریخ الأدب العربي-کارل بروکلمان، مترجم: ڈاکٹر عبدالحلیم النجار، طبع خامس، دار المعارف، قاھرہ، ۱۹۵۹.

۲-تاریخ آداب اللغة العربية-جُرجی زیدان، مؤسسة هنداوی، قاھرہ، ۲۰۱۲.

۳-تاریخ الأدب العربي-احمد حسن زیات، دار نهضه مصر، قاھرہ، ب.ت.

۴-تاریخ الأدب العربي-عمر فروخ، طبع رابع، دار العلم للملايين، بیروت، ۱۹۸۱.

۵-تاریخ الأدب العربي-شوقي ضيف، گیارہواں ایڈیشن، دار المعارف، قاھرہ، ۱۹۷۳.

۶-الأدب العربي المعاصر في مصر-شوقي ضيف، دسواں ایڈیشن، دار المعارف، قاھرہ، ۱۹۶۱.

۷-تاریخ الأدب العربي-حنّا فاخوری، طبع ثانی، مطبعہ بولسیہ، بیروت، ۱۹۵۳.

۸-تاریخ الأدب العربي العصر الجاهلي-واضح رشید ندوی، مؤسسة الصحافة والنشر، ندوة العلماء، لکھنؤ، ۲۰۱۰.

۹-تاریخ الأدب الإسلامی العصر الإسلامی-محمد رابع حسنی ندوی، مؤسسة الصحافة والنشر، ندوة العلماء، لکھنؤ، ۱۹۹۸.

۱۰-أعلام الأدب العربي في العصر الحديث-واضح رشید ندوی، دار رشید، لکھنؤ، ۲۰۰۹.

۱۱-تاریخ ادب عربی، مترجم: عبد الرحمن طاہر سورتی، مرتب و ملخص: سید طفیل احمد مدنی، ایوان کمپنی الہ آباد، ۱۹۸۵.

۱۲-تاریخ ادبیات عربی-سید ابوالفضل، انجمن فیضان ادب، حیدرآباد ۲۰۰۹.

۱۳-عربی ادب کی تاریخ-عبدالحلیم ندوی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، ۱۹۷۹.

۱۴-عربی ادب کی تاریخ-محمد کاظم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴.

بیسویں صدی عیسوی میں مستشرقین کی نگارشات پر مسلمانوں کا ردعمل:
ڈاکٹر مصطفی السباعی کی کتاب ''اسلام اور مستشرقین'' کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر شیخ جمیل علی

سینیر اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ (کشمیر)

Sheikh.jameil@gmail.com

بلال احمد بٹ

ریسرچ اسکالر، اسلامک اسٹڈیز، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ (کشمیر)

bilal.bhat@islamicuniversity.edu.in

مسلمان علماء اور محققین میں جن اہل نظر، مفکرین اور دانشوروں نے استشراقی ادب کا تجزیہ کرنے اور ان کے اعتراضات کا مکمل جواب دینے کی کوششیں کیں ان میں سر سید احمد خان (متوفی ۱۸۹۸) علامہ شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴)، ڈاکٹر مصطفی السباعی (متوفی ۱۹۶۴)، ڈاکٹر امیر حسن (متوفی ۱۹۹۶)، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی (متوفی ۱۹۹۹)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس (متوفی ۲۰۰۲)، ڈاکٹر محمد مہر علی (متوفی ۲۰۰۷)، مریم جمیلہ (متوفی ۲۰۱۲)، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (متوفی ۲۰۱۶)، ڈاکٹر مصطفی الاعظمی (متوفی ۲۰۱۷)، پروفیسر خورشید احمد (۱۹۳۲)، ڈاکٹر محمد خلیفہ (۱۹۲۹)، ڈاکٹر محمد اکرم چودھری (۱۹۵۰)، وغیر ہم کے نام نمایاں اور قابل ذکر ہیں۔ ان محققین اور علماء نے مستشرقین کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسلامی متون، اسلام کی تاریخ اور اس کے نظریات کا مبہم اور غلط تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مستشرقین کی جانب سے اسلام کے بارے میں غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور ان کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے[1]۔ ان محققین نے نہ صرف استشراقی تسامحات اور اغلاط کی نشاندہی کی اور ان کے اصول و منابع تحقیق اور طریقہ کار کے نقائص طشت از بام کیے بلکہ ان کی تمام علمی و تحقیقی غلطیوں اور التزامات و اعتراضات کا زبردست تنقیدی و تحلیلی جائزہ لیا۔ ان اسکالرز نے کھل کر

---

[1] مجتبی فاروق، استشراقی ادب کا محاکمہ: سر سید احمد خان اور علامہ شبلی نعمانی کے حوالے سے، سبق اردو، جولائی ۲۰۲۲، شمارہ ۷ /۶۷، ص: ۱۴۷

مستشرقین کے فکری حملوں کا توڑ کیا اور ان کی تمام غلط بیانیوں اور ان کی زہر افشانیوں کو تحقیقی زبان میں اور علمی دلائل کی بنیاد پر مشتہر کیا اور ان کا لگایا گیا انجکشن زیادہ عرصے تک جدید تعلیم یافتہ اذہان کو متاثر نہیں کر پایا۔ اس طرح مسلم محققین نے ایک بڑا علمی مواد فراہم کیا جس سے علمی اور تحقیقی دنیا کو کافی رہنمائی ملی ہے۔ مستشرقین انیسویں صدی عیسوی تک اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر نقطہ چینیاں کرتے رہے۔ مگر ان متذکرہ اور ان جیسے کئی اور باہمت و باحمیت علما اور دانشوروں نے ان کے کھو کھلے الزامات و اعتراضات کے جواب میں تحقیقی و فکری کتابیں اور مقالات لکھے[۲]۔ بیسویں صدی میں مستشرقین کی علمیت بڑھی اور ان کے دائرہ کار میں اضافہ ہوا تو ان کی انتہائی جارحیت بھی روز افزوں ہوئی، انھوں نے قرآن کا من جانب من اللہ ہونے اور حدیث کی صحت و استناد پر سوالیہ نشانات قائم کیے نیز فقہ اسلامی اور احیاء اسلامی پر سخت تنقید کیں اور مختلف تحریکوں اور مجددین کے ذریعے سے اسلام کے احیاء نو کی کوششوں اور کاوشوں کو دقیانوسیت، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا نام دینے لگے[۳]۔

مستشرقین کے ان بے بنیاد اعتراضات کا مدلل انداز میں جواب دینے کے لیے مسلم محققین میں سے کسی نے مستشرقین کے ذریعے سے قرآن پر، کسی نے احادیث اور علوم الحدیث، کسی نے فقہ اسلامی اور بعض علماء نے سیرت نبوی ﷺ پر کئے گئے اعتراضات کا جواب فراہم کرنا اپنا تحقیقی موضوع بنایا اور بعض نے تاریخ، تصوف اور اسلامی تحریکوں اور ان کے اکابرین پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب دینا اپنا مطمح نظر سمجھا۔ ان علماء اور محققین نے اس جدید جہالت[۴] اور اس سیلاب کو روکنے اور اس پر بند باندھنے کی زبردست کوششیں کیں۔ اس ضمن میں مولانا ابو الحسن علی میاں ندوی رقم طراز ہیں کہ: "اس

---

[۲] ماخذ سابق، ص: ۱۴۷

[۳] ۹/۱۱ کے واقعے کے بعد سے اب تک ان مستشرقین نے سب سے زیادہ کتابیں اور مقالے اسلامی تحریکات اور ان کے اکابرین کے خلاف تحریر کیں ان مستشرقین میں سب سے نمایاں نام درج ذیل ہے: اولیویر رائی (Olivier Roy)، جان ایل ایسپازیٹو (John L. Esposito)، جان اوبرٹ وال (John Obert Voll)، ایمینول سیوان (Emmunuel Sivan)، بسام طیبی (Bassam Tibi)، جیمز پسکاٹوری (James Piscatori)، تمارا سون (Tamara Sonn)، گیلیس کیپیل (Gilles Kepel)، پیٹر آر ڈیمانٹ (Peter R. Demant)، فوزان جرجس (Fawzan Gerges)، پیٹر مینڈاویلی (Peter Mendaville) وغیرہ کے ہیں۔

[۴] مولانا مودودی مغرب کی طرف سے اس طرز عمل کو جدید جہالت سے تعبیر کرتے ہیں، ملاحظہ ہو تصریحات، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۸۰ء، ص: ۲۰۳

موضوع پر اس طرح کام ہوا ہے کہ وہ تمام اعتراضات، مستشرقین کی وہ تمام تحقیقات جن پر ان کو ناز تھا، کم درجہ ثابت ہو کر رہیں اور علمی مجلسوں میں ان کی غلطی، استدلالی کمزوری، مستشرقین کے ذہن کی نارسائی اور دانستہ مغالطہ لکھنے کی کوششوں کا راز فاش ہوتا چلا گیا اور ان کی طرف سے وہ توجہ اور وہ التفات بھی ختم ہو گیا جس کو لوگ پہلے اعزاز سمجھتے تھے اور ان کے پڑھنے پڑھانے کا اہتمام کرتے تھے"[۵]۔ راقم نے اس مقالے میں ڈاکٹر مصطفی السباعی کی کتاب "المستشرقون والاسلام" اور اس کے بنیادی مباحث کو اجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر مصطفی سباعی شام کے مشہور سیاسی مفکر، معلم، مصنف اور شام میں اخوان المسلمین کے بانی تھے۔ ڈاکٹر سباعی الازہر یونیورسٹی مصر میں سیاسی طور پر بہت متحرک رہے جہاں وہ اخوان المسلمین کے بنیادی رکن اور امام حسن البنا شہید کے دوش بہ دوش دعوتی سرگرمیوں کا حصہ رہے۔ اسی دوران مصر میں انگریزوں کے خلاف مظاہروں میں پابند سلاسل کئے گئے اور بعد میں رہا بھی کئے گئے۔ ڈاکٹر سباعی ۱۹۴۰ء میں دمشق یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر مقرر اور اسی یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں شباب محمد کی بنیاد ڈالی جو اخوان المسلمین کے طرز پر شام میں کام کرتی تھی اور بعد میں ۱۹۴۶ء میں اخوان المسلمین شام کی بنیاد ڈالی۔ ڈاکٹر مصطفی سباعی کا اصل کارنامہ امت کا اپنی تہذیب و ثقافت پر اعتماد بحال کرنا، انہیں اپنے اسلامی تشخص پر فخر کرنا سکھانا اور مسلمانوں کے علوم اور تہذیب پر مستشرقین کی جانب سے ڈالی گئی گرد و غبار کو صاف کر کے اس کی حقیقی صورت سامنے لانا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی انہوں نے مستشرقین پر کام شروع کیا اور آغاز ہی میں ان کی علمی کمزوریوں کو بھانپ گئے، جس کی تصدیق بعد کی علمی تحقیقات اور مستشرقین کے ساتھ نجی ملاقاتوں نے بھی کر دی۔

اس ضمن میں انہوں نے بہت کچھ سپرد قلم کیا۔ انھوں نے اپنی گراں قدر اور عظیم "السنة ومكانتها في تشريع الإسلامی"[۶] میں ایک باب مستشرقین کی طرف سے سنت پر اٹھائے گئے اعتراضات و

---

[۵] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اسلامیات اور مغربی مستشرقین اور مسلمان مصنفین، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص: ۶۸

[۶] مولانا معراج محمد، ڈاکٹر مصطفی سباعی اور محاکمہ استشراق، ماہنامہ مفاھیم فقہ اکیڈمی پاکستان، جلد ۱، شمارہ ۲ ص: ۴۵

اشکالات کے ازالے کے لیے خاص کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے استشراق اور مستشرقین پر الگ سے بھی کام شروع کیا، مگر کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔اس سلسلے میں جو کام ہوا تھا وہ "المستشرقون:مالها وما عليها" کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے استشراق کی تاریخ اور اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ انصاف پسند اور متعصب مستشرقین کی نشاندہی بھی کی ہے۔ان کا یہ کام مختصر ہونے کے باوجود بہت اہم ہے۔انہوں نے متاثر غرب زدہ دانشوروں کا اجمالاً ذکر کیا ہے جن میں سر فہرست ڈاکٹر طٰہٰ حسین صاحب ہیں، جن کا کہنا ہے کہ عربی ادب کے استاد اور ماہر کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ فرانسیسیوں کے ان نتائج علم کو نہ دیکھ لیں، جن تک وہ مشرقی تاریخ و ادب اور مختلف زبانوں کے مطالعے سے پہنچ چکے ہیں[۷]۔اور جب تک ہم اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور اپنے پروں پر اڑنے کے قابل ہو کر تاریخ وادب پر ان کا علمی غلبہ ختم نہیں کر دیتے،اس وقت تک ہمیں اپنا علم (تاریخ وادب اور زبان وغیرہ) انہی سے لینا پڑے گا۔ڈاکٹر سباعی صاحب نے اس پر کیا خوب تبصرہ کیا: ''بلاشبہ یہ ہمارے فکری غلامی کے ادوار کی ترجمانی ہے، جس سے ہم اپنے جدید فکری اور علمی ثقافت کے آغاز میں ہو گزرے ہیں''۔ ڈاکٹر سباعی صاحب نے طٰہٰ حسین صاحب کی کتاب ''الأدب الجاهلي'' کو مرگولیوتھ (Samuel Margoliouth) کی آرا کا ترجمہ قرار دیا ہے[۸]۔

ڈاکٹر سباعی کی اس شاہکار تصنیف کو مولانا سلمان شمسی ندویؒ نے اردو میں ترجمہ کر کے اس کا نام ''اسلام اور مستشرقین'' رکھا۔ایڈورڈ سعید[۹] کے بعد ڈاکٹر سباعی پہلے مسلم مفکر ہیں جنہوں نے اس اہم

---

[۷] ماخذ سابق، ص: ۴۵

[۸] مولانا معراج محمد، ڈاکٹر مصطفی سباعی اور محاکمۂ استشراق، ماہنامہ مفاھیم فقہ اکیڈمی پاکستان، جلد ۱، شمارہ ۲، ص: ۴۵

[۹] فلسطینی عیسائی العقیدہ مصنف اور دانشور، پروفیسر ایڈورڈ سعید (Edward W. Said) یروشلم میں پیدا ہوئے لیکن ۱۹۴۷ء میں پناہ گزین بن جانے کے بعد وہ امریکہ چلے گئے اور ساری عمر وہیں رہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ انہوں نے ساری زندگی فلسطینیوں کے حقوق کے لئے عملی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ عرب دنیا کے بجائے مغرب میں زیادہ معروف تھے اور شاید اس کا سبب یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان مین لکھتے رہے لیکن ان کے قلم کا اثر عرب دنیا میں بھی ویسا ہی رہا جیسا کہ باقی دنیا میں ہوا۔

سعید نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں اور مقالے تحریر کئے تاہم جس کتاب نے انہیں سب سے زیادہ شہرت بخشی وہ

اور حساس موضوع پر نہ صرف قلم اٹھایا ہے بلکہ اس کا حق بھی ادا کیا ہے۔اردو میں اس کتاب کا تعارف مولانا محمد رابع حسنی ندوی مرحوم(سیکریٹری مجلس تحقیقات و نشریات اسلامی اور ناظم ندوۃ العلماء لکھنو)نے لکھا ہے۔اردو میں ہی ضمیمہ کے طور پر ایک اہم باب ''مغربی مستشرقین کے فکر و فلسفہ کا اثر''کا اضافہ کیا گیا، جس کو بر صغیر کے نامور مفکر و مصنف مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے تحریر کیا ہے۔اس باب کے اضافے سے کتاب کی مقبولیت مزید بڑھ گئی۔ضمیمہ کے علاوہ اس کتاب کو آٹھ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور کتاب حرف آخر اور مصنف کے مختصر سے تعارف پر ختم ہوتی ہے۔

ضمیمہ میں مولانا علی میاں ندوی صاحب مستشرقین کے ان بنیادی افکار کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے ہمارے معاشرے کا دانشور و حکمراں طبقہ جو مغربی اداروں سے پڑھ کر یا مغربی مصنفین کی تصانیف سے متاثر ہو کر اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں شک میں مبتلا ہوا۔مولانا لکھتے ہیں کہ ''استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے۔اس کے کئی محرکات تھے جن میں دینی، سیاسی اور اقتصادی (محرکات) خاص طور پر قابل ذکر ہیں''[10]۔ آگے ندوی صاحب مستشرقین کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ''ان علماء مغرب نے اسلامیات کے مطالعہ کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں''۔اس علمی اعتراف کے باوجود ندوی صاحب انہیں اہل علم کا وہ بد قسمت اور بے توفیق گروہ سمجھتے ہیں کہ جنھوں نے قرآن و حدیث، سیرت نبویؐ، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے مگر بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آئے۔مولانا لکھتے ہیں: ''اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں زہر کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر و بدگمان نہ کر دے''[11]۔

کتاب کے پہلے باب میں مصنف مستشرقین کے تاریخی پس منظر کے متعلق رقم طراز ہیں کہ ''مستشرقین کی یہ تحریک مغربی راہبوں کے ہاتھوں شروع ہوئی جنھوں نے اندلس کے عظیم گہوارۂ

''Orientalism'' ہے جس کا اردو ترجمہ ''شرق شناسی'' کے نام سے البلاغ پبلی کیشنز کے توسط سے شائع ہوا ہے۔

[10] الاسلام و المستشرقون، ڈاکٹر مصطفی السباعی، ترجمہ: سید سلمان شمسی ندوی، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۹۰، ص: ۱۲

[11] ماخذ سابق، ص: ۱۳

علم میں پناہ لی اور وہیں کی درسگاہوں میں علمی نشوونما پائی اور پھر ان کے قلم سے قرآن مجید اور دوسری عربی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ان مغربی دانشوروں نے مسلمان علماء کی مجلسوں میں رہ کر مختلف علوم پر عبور حاصل کیا جن میں خاص طور پر فلسفہ، طب اور ریاضی قابل ذکر ہیں"۔ مصنف لکھتے ہیں کہ "ان راہب عالموں کی فہرست میں ہمیں سب سے پہلے مشہور فرانسیسی راہب جیر برٹ کا نام ملتا ہے جو اندلس سے واپسی کے بعد ۹۹۹ء میں روم کے کلیسا کا پادری مقرر ہوا"۔ آگے لکھتے ہیں کہ "مستشرقین کی پہلی کانفرنس ۱۸۱۲ء میں پیرس میں ہوئی اور پھر مختلف اوقات میں پے در پے ایسی کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا رہا جس میں مشرقی مذاہب اور تہذیبوں کو مطالعہ و تحقیق کا موضوع بنایا گیا"[۱۲]۔

دوسرے باب میں مصنف مستشرقین کے اصل میدان کے بارے میں رقم طراز ہے کہ "تحریک استشراق کی ابتدا عربی زبان اور اسلام کے سیکھنے سکھانے سے شروع ہوئی لیکن مشرق وسطی میں مغرب کی سامراجی یورش کے بعد استشراق کا میدان مزید وسیع ہوتا چلا گیا اور ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مشرق کی تمام تہذیبوں، زبانوں اور ادیان و مذاہب کا مطالعہ شروع ہوا جس میں مشرق کے رسم و رواج اور جغرافیائی حالات کو بھی پیش نظر رکھا گیا لیکن ان سب میں عربی زبان وادب اور اسلامی تحقیقات کو خاص اہمیت دی گئی اور اسلام کے مطالعے کا بنیادی مقصد ان کے ہاں صرف یہ تھا کہ اس کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کیا جائے اور اس کی حسین و معصوم تصویر کو بگاڑا جائے"۔ آگے لکھتے ہیں کہ "تحریک استشراق میں کچھ لوگ جن کی تعداد بہت کم ہے ایسے بھی ہوئے جنھوں نے عام مستشرقین کے اسلوب کو نہیں اپنایا بلکہ ان میں بہت سے ایسے خوش نصیب بھی تھے جنھیں اپنے اس مطالعہ کی بدولت اسلام کا شرف نصیب ہوا"[۱۳]۔

تیسرا باب مستشرقین کے مقاصد و وسائل سے متعلق ہے، یعنی اسلام کے تئیں مستشرقین کے کیا مقاصد ہیں اور ان مقاصد کے حصول کے لئے انھوں نے کون سے وسائل کو اختیار کیے۔ ان کا سب سے پہلا مقصد "حضور اکرمؐ کے پیغام ابدی میں شکوک اور اس کے براہِ راست آسمانی پیغام ہونے میں شبہات پیدا کرنا ہے۔ رسول اکرمؐ سے متعلق مستشرقین کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی بعثت ان کے لئے انبیاء کی تاریخ میں انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کو انوکھا سمجھنے سے ان کی عقل قاصر

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص: ۳۰

[۱۳] ماخذ سابق، ص: ۳۵، ۳۶

ہے۔آپؐ کی نبوت اور قرآن کے آسمانی ہونے کا تصور بھی ان کی فہم سے بالاتر ہے،ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام گزرے ہوئے مذاہب خاص طور سے مسیحیت اور یہودیت کی ملی جلی تصویر ہے۔ مصنف کے مطابق اس دعوی کی پشت پناہی سب سے زیادہ ''شاخت''اور ''گولڈزیہر'' نے کی ہے''[۱۴]۔

مصنف مستشرقین کے دینی وسیاسی مقاصد و مصالح کے اگلے باب میں لکھتے ہیں کہ ''مستشرقین نے قرآن، شریعت اور فقہ اسلامی کو مشتبہ کر کے اس کو دو قسموں میں تقسیم کیا اور اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے تمدن و کلچر کو جھٹلا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی تہذیب دراصل رومن کلچر کی دین ہے''۔یعنی عربوں اور مسلمانوں کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہے جو کچھ بھی ہے وہ سب کچھ مغرب کی مرہونِ منت ہے۔اس دعوے کے ذریعے سے انہوں نے مسلمانوں اور خاص طور پر عربوں میں قومیت کے جذبات کو ابھار کر مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیر دیا ہے جس کی مثال آج کے مشرق وسطی میں ہمارے سامنے عیاں ہے۔

پانچواں باب مستشرقین کے رسائل و تصنیفات سے متعلق ہے۔ جس میں مصنف رقم طراز ہیں کہ مستشرقین نے اپنی مہم کو چلانے کے لئے ہر ممکن وسیلہ اپنایا ہے جن میں چند اس طرح ہیں:

۱۔ مختلف اسلامی موضوعات پر کتابیں تالیف کیں جن میں قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا۔

۲۔مجلات و رسائل کی اشاعت، جس میں اسلام اور بلاد عربیہ کو موضوع بحث بنایا گیا۔

۳۔عالم اسلام میں غیر سرکاری تنظیموں کی شکل میں مشنریوں کا قیام جو بظاہر انسانی خدمات کے تحت ہسپتال، یونین، کالج، یتیم خانے، مہمان خانوں کی شکل میں بہت سے مقامات پر باقاعدہ موجود ہیں۔

۴۔مقامی اخبارات میں مقالات شائع کرائے اور مسلم ملکوں سے نکلنے والے اچھے خاصے جرائد کو خرید کر رکھا ہے۔

۵۔اپنے ذہنی خاکوں کو عملی شکل دینے کے لیے مختلف کانفرنسوں کا انعقاد جو ۱۷۳۸ سے لے کر اب تک برابر جاری ہے[۱۵]۔

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص: ۴۵، ۴۶۔

[۱۵] ماخذ سابق، ص: ۴۸، ۵۱

چھٹے باب میں مشہور مستشرقین اوران کی تصانیف کاذکر کیا گیاہے۔اس باب کے پہلے حصے میں مصنف متعدد مستشرقین اوران کی تصانیف کا مختصر سا تعارف کراتے ہیں جن میں اے جے آربری (A.J. Arberry)، الفرڈ گیوم (Alfred Guillaume)، ایچ اے آر گب(H. A. R. Gibb)، گولڈزیہر(Ignac Goldziher)، جان مائی نارڈ(John maynard)، ایس ایم زویمر (S.M. Zwemer)، فلپ کے حتی(P. K. Hitti)، اے جے وینسینک(A.J. Wensinck)، مجید خدوری(Majid Khadduri)،آراے نیکولسن(R A Nichalson) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔علاوہ ازیں وہ مستشرقین جنھوں نے تاریخ اسلام اور رسول اکرمؐ کی سیرت طیبہ سے متعلق کتابیں لکھی ہیں ان کا الگ سے تذکرہ کیا گیاہے جن کی تعداد۲۳ سے زیادہ ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مستشرقین کاایک اہم ادارہ ہے۔اس کی اشاعت سب سے پہلے ۱۹۳۱ء میں دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئی۔اس کے شائع کرنے میں ایچ اے آر گب، اے جے وینسینک، مارٹن تھیوڈور ہوٹسما وغیرہ کا قابل ذکر کردار ہے۔اس کا پہلا ایڈشن ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء تک شائع ہوا ہے جبکہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء سے ۲۰۰۵ء تک اور تیسرا ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔یہ دائرہ مسلمانوں اور اسلامی موضوعات پر مبنی ایک دائرۃ المعارف ہے جس کی ترتیب و طباعت میں مستشرقین کی پوری ٹیم کام کرتی ہے۔مصنف نے اپنی اس کتاب میں اس دائرہ کے اہم ترین مرتبین کی مختصر سی فہرست دی ہے جن کی تعداد ۶۸ تک پہنچ گئی ہے۔

ساتواں باب مستشرقین کے معیارِ بحث و تحقیق سے متعلق ہے۔اس باب میں مصنف رقم طراز ہے کہ ''عام طور پر مستشرقین اسلامیات کے موضوع پر بحث کرتے وقت اس علمی دنیامیں بھی انتہائی اجنبی، غیر مانوس اور تعجب خیز طریقے اختیار کرتے ہیں۔ہمارے مستشرقین میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بہت پہلے سے اپنے ذہن میں ایک نقشہ متعین کر لیتے ہیں اور پھر اپنے تصورات کو عملی دنیا میں لانے اور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں''۔اس حوالے سے مصنف ایک مشہور مستشرق گولڈزیہر کی مثال دیتے ہیں جس میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ حدیث کل کی کل تیسری صدی ہجری کی پیداوار ہے اور یہ اصلاً حضورؐ کے اقوال نہیں ہیں۔اور شریعتِ اسلامی کے احکام اسلام کے عہدِ اول میں مسلمانوں کے نزدیک جانے بوجھے نہ تھے۔اپنی اس دلیل کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیتے ہے جن کا اس موضوع سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے مثلاً گولڈزیہر اتنی بڑی بات کے لئے دامیری کی کتاب ''کتاب الحیوان'' کا حوالہ دیتے ہے۔اسی طرح کارل بروکلمان(Carl Brockelmann) کے

متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے لفظ ''رعیہ'' سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عرب عجمی مسلمانوں کو ریوڑ کی حیثیت سے دیکھتے تھے حالانکہ اگر لغت کا سہارا لیا جائے تو ''راعی'' کے معنی ذمہ دار اور پرسانِ حال کے بھی ہوتے ہیں''[۱۶]۔

کتاب کا سب سے اہم حصہ آخری باب ہے جس میں مصنف نے اپنے ہم عصر مستشرقین کا ذکر کیا ہے جن سے ان کی ملاقات ہوئی ہے، ان میں پروفیسر اینڈرسن (Prof. Anderson)، پروفیسر اے جے آربری (Prof. A. J Arberry)، جوزف شاخت (Joseph Schacht)، وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مصنف ان کے حوالے سے رقمطراز ہے کہ ''۱۹۵۶ء میں مجھے پہلی بار ان مستشرقین سے ملنے کا موقع ملا اور اس وقت ان کے حسد، بغض اور عداوتِ اسلام کا احساس ہوا''۔ پروفیسر اینڈرسن (Prof. Anderson) سے اپنی ملاقات کی روداد میں لکھتے ہیں: ''پہلے میری ملاقات جامعہ لندن کے پروفیسر اینڈرسن سے ہوئی۔ یہ پروفیسر ہمارے کٹر مسلکی طبقے کی طرح ٹھیٹھ اور مقلد واقع تھے۔ کہنے لگے کہ میں نے ایک فاضل ازہر کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے نااہل اس لئے قرار دیا کہ اس نے اپنے مقالے میں اس بات پر دلائل پیش کیے تھے کہ اسلام عورت کو اس کے پورے حقوق دیتا ہے۔ میں نے حیران ہو کے پوچھا: ''آخر آپ اسے کیسے نااہل کر سکتے ہیں جب کہ آپ لوگ اپنی جامعات میں آزادیٔ فکر کے دعوے دار ہیں؟'' پروفیسر نے جواب دیا: ''کیونکہ وہ از خود ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسلام نے عورت کو فلاں فلاں حقوق دیے ہیں، تو کیا وہ اسلام کا کوئی مستند ترجمان بنا ہوا تھا؟ مزید یہ کہ اس کے نتائج کی تائید میں فقہا کی تصریحات موجود نہیں تھیں۔ وہ آدمی خود پسندی کا شکار تھا جس کو ابو حنیفہ اور شافعی سے بڑھ کر اسلام سمجھنے کا زعم تھا''[۱۷]۔

ڈاکٹر مصطفی السباعی جب آکسفورڈ پہنچے تو وہاں شعبہ اسلامیات کا سربراہ ایک یہودی تھا جو ٹھیک سے عربی نہیں بول سکتا تھا۔ ڈاکٹر سباعی صاحب کو حیرت ہوئی کہ یہ صاحب طلبہ کو زمخشری کی کشاف سے قرآنی آیات، بخاری و مسلم سے احادیث، حنفی اور حنبلی کی امہات کتب فقہ پڑھا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب ان سے مطالعہ کا مآخذ پوچھا تو انھوں نے اگناز گولڈ زیہر (Ignaz Goldziher)، جیمز مرگولیوتھ (James Samuel Margoliouth) اور جوزف شاخت (Joseph Schacht) کا حوالہ دیا۔

---

[۱۶] ماخذ سابق، ص: ۸۵

[۱۷] ماخذ سابق، ص: ۹۶

لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر امین مصری نے (جو ازہر کے شعبۂ اصول دین کے فاضل تھے) جامعہ لندن سے شاخت پر تنقیدی مقالہ لکھنا چاہا تو انھیں اجازت نہیں ملی۔ پروفیسر اینڈرسن نے صاف انکار کیا، وہ وہاں سے مایوس ہو کر کیمبرج چلے گئے۔ وہاں انھیں صاف کہا گیا کہ اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری میں کامیابی چاہیے تو مسٹر شاخت پر تنقید سے بچ کر رہنا ہوگا، کیونکہ جامعہ اس کی اجازت نہیں دے گی۔ تب انھوں نے اپنا موضوع بدل لیا[۱۸]۔

کتاب کے آخری حصے میں ڈاکٹر صاحب نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ اگر ہمارے کچھ لوگ مستشرقین کے کام کا اس طرح سے ناقدانہ جائزہ لیں جس طرح انھوں نے ہمارے اسلاف کے ساتھ کیا ہے۔ پھر مستشرقین اس کام کو دیکھیں تو انھیں اندازہ ہوگا کہ جو طریقہ انھوں نے ہمارے دین اور تاریخ میں حقائق دریافت کرنے کے لیے وضع کیا ہے اس سے کیسے نتائج نکلتے ہیں اور اس طرح ان کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔ آج بھی ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ حسن عبدالقادر صاحب کی طرح اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ مستشرقین، غیر جانب دار، منصف مزاج اور معتدل ہوتے ہیں، اور ان کا رویہ خالص علمی ہوتا ہے، مگر حقائق اس کے بر خلاف ہیں اور استشراق کا گہرا مطالعہ کرنے والے تقریباً تمام اہل علم اسی نتیجے پر پہنچے ہیں جو ڈاکٹر سباعی صاحب نے بیان کیا ہے۔

مستشرقین کے حوالے سے اپنے تاثرات اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ: ''مستشرقین اپنی پوری برادری کے ساتھ یہودی، پادری یا سامراجی ہوتے ہیں۔ استشراق کے چشمے عموماً کلیسا سے پھوٹے ہیں اور سامراجی ملکوں میں ان کے ساتھ گرجا اور وزارتِ خارجہ پہلو بہ پہلو ساتھ ہیں''[۱۹]۔

مصنف حرف آخر میں امت کے ان جوانوں کو دعوت دیتے ہیں جو علم و تحقیق کے میدان میں سرگرم عمل ہیں کہ ''آیئے مغرب کے معیار نقد کو استعمال کرکے ان کی تہذیب و عقائد کو اسی طرح پیش کریں جس طرح انہوں نے پیش کیا ہے۔ پھر وہ دیکھیں گے کہ ان کا خود ساختہ طریقہ کس طرح انہیں کو لوٹ آیا جس کے متعلق وہ کبھی سوچا کرتے تھے کہ وہ ہماری تاریخ اور ہمارے دین کو پہچاننے کا ذریعہ ہے۔'' یہ کتاب ڈاکٹر سباعیؒ کے مختصر سے تعارف پر ختم ہو جاتی ہے۔

مختصراً یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اہم ہے۔ مترجم نے عام فہم زبان استعمال کی ہے تاکہ ایک

---

[۱۸] ماخذ سابق، ص: ۹۸

[۱۹] ماخذ سابق، ص: ۱۰۱

درمیانی درجہ کا مسلمان بھی سمجھ سکے کہ اسلام کے متعلق مغرب کن ہتھکنڈوں کا استعمال کررہا ہے اور اسلام کی بے داغ اور پرامن تصویر کو مسخ کرکے کس طرح ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام کو دہشت گردی کا پیشوا اور مسلمانوں کو ایک غیر مہذب مذہب کا پیروکار ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔

درست قوتِ فیصلہ اور راست طریقہ کار
شری مد بھگوت گیتا کے تناظر میں

ڈاکٹر بلوِندر سنگھ

شعبہ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

balvindersingh@bhu.ac.in

یسمدھرم مئی گیتا سروِ گیان پریوجیکا
سروشاشتر مئی گیتا تسماد گیتا وشیشت

انسانی زندگی میں کچھ ایسے لمحے آتے ہیں جب انسان شدید کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ فیصلہ لینے کی حالت میں نہیں ہوتا، ایسے موقعوں پر کہا جاتا ہے کہ چھٹی حس (Sense) کام کرتی ہے۔ یہ حس تجربہ، مطالعہ، شعور اور لاشعور بلکہ تحت الشعور میں موجود وہ دانش ہوتی ہے جو رائے راست پر رہنے یا درست قوتِ فیصلہ لینے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ چیز کیسے اور کہاں سے آتی ہے اس کا ابھی تک قطعی مطالعہ نہیں کیا جاسکا لیکن اس کی ایک مثال ہمارے مذہبی صحائف بالخصوص شری مد بھگوت گیتا میں ملتی ہے۔

سناتن دھرم کے ماننے والوں میں شری مد بھگوت گیتا کی اہمیت کا اندازہ اس میں موجود علوم و فنون کے نچوڑ سے ہوتا ہے۔ ہندو مذہب کے گرنتھوں میں: وید، پُران، اُپنشد، مہابھارت، شروتی، منوسمرتی، درشن، رامائن، دھرم شاشتر، رام چرت مانس، اور یوگ درشن تقریباً تمام شاشتروں کا ماحصل بھگوت گیتا میں موجود ہے۔ اسی لیے اس کو مذہبی صحائف میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ بھگوت گیتا کا ظہور اس وقت ہوا جب ارجن میدان جنگ میں اپنے قریبی راشتہ داروں کو دیکھتے ہیں اور شدید کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حق اور باطل کی کشمکش میں ارجن کو جب شری کرشن نے مبتلا پایا، اس وقت جو شری کرشن بھگوان کی زبان سے نکلیں، وہی متن صدیوں سے ہمارے سامنے شری مد بھگوت گیتا کی صورت میں موجود ہے۔ گیتا میں فلسفۂ عمل، فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات کے جو اصول و ضوابط بتائے گئے ہیں، انہی پر چل کر روحانی تسکین اور راہ نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ شری مد بھگوت گیتا شہکار نظم ''مہابھارت'' کا وہ جُزو ہے جسے مہارشی وید ویاس نے سات ہزار سال قبل مسیح نظم کیا تھا۔

گیتا ہمیں بہت سے سبق دیتی ہے اور ہم اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس سے مطالب اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح بھگوت گیتا کا مفہوم مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے تاہم اس نے مطالعہ کرنے والوں

کو جس مشترکہ قیمتی تحفے سے نوازا ہے، وہ یہ کہ قاری کے ذہن میں بلا امتیاز عمر، صلاحیت پیشہ یا فرقہ اُمید پیدا ہوتی ہے۔ بھگوت گیتا کا یہ پیغام کہ انسان خدا، ایشور یا بھگوان کا محض روپ ہے تحریک عمل کا سرچشمہ ہے۔ بس انسان کو اپنی حقیقت اور اصلیت جاننے کے لیے اس خول کو توڑنا پڑے گا جس میں وہ مقید ہے اور ساتھ ہی اسے ہر سمت آگے بڑھنا ہوگا۔ بنیادی طور پر بھگوت گیتا یہی سبق دیتی ہے کہ آگے کس طرح بڑھا جائے، گیتا نے جو راستے بتائے ہیں اسے تمام انسان اپنا سکتے ہیں۔

بھگوت گیتا کی تعلیمات میں سب سے زیادہ مسحور کن سبق، وہ انوکھی تعلیم ہے جو کسی مسئلے کے حل کے سلسلے میں فیصلہ کرنے اور اس تک پہنچنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بات گیتا کے متن میں کھل کر کہی گئی ہے۔ جس کی مثال شری کرشن اور ارجن کے اس مکالمے سے اخذ کی جاسکتی ہے۔ جس دوران ارجن فیصلہ نہ کر پانے کی اذیت ناک حالت سے گزر رہے تھے۔ در حقیقت یہ فیصلے پر پہنچنے کے خواہشمند فرد کے لیے ایک درجہ بدرجہ طریق کار ہے۔ جو صورت حال کے تجزیہ پر مبنی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا انحصار انسان کے نفسیاتی اور معاشرتی تانے بانے پر بھی ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں انسان کو کن مرحلوں سے گزرنا چاہیے، اس کی نشاندی شری مد بھگوت گیتا میں بحسن وخوبی کی گئی ہے۔ اس عمل کے آٹھ (۸) مرحلے بتائے گئے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ سلسلہ بہ سلسلہ مربوط ہیں۔

ان آٹھ نکات میں پہلا قدم وہی ہونا چاہیے جو ارجن نے اس وقت اٹھایا جب ان کے ذہن میں اپنے فرض کے تئیں شک وشبہات پیدا ہوئے اور وہ دو متضاد امکانات کے درمیان خود کو پا رہے تھے۔ چنانچہ بھگوت گیتا میں جب ارجن شری کرشن سے دونوں فوجوں کے درمیان اپنا رتھ کو لے جانے کی بات کرتے ہیں تو یہ ذہن کے تجزیہ کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اس کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ فیصلہ کی تلاش میں سب سے پہلے دل میں کسی تعصب یا خیال کو جگہ دیئے بغیر عمل کے جس قدر ممکن راستے ہیں، اُن پر نظر ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے اُس کا درپردہ مطلب یہی ہے کہ انسان کو ممکنات میں سے کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف پہلے سے قائم شدہ مفروضے یا خیال سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہ ممکن ہے کہ عمل کے سلسلے میں جو ممکن راستے ہیں اُن کے بیچ میں غیر جذباتی ہو کر کھڑے ہونے کے نتیجے میں ہم اُس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں جو ہماری اپنی رائے میں صحیح ہیں۔ اگر تذبذب کی حالت باقی رہے اور کسی فیصلے پر نہ پہنچا جاسکے تو فیصلہ کرنے کے عمل کے سلسلے میں دوسرے مرحلے کا طریقہ اپنانا چاہیے۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ اپنے مسئلہ کو اپنے گرو (استاد) سے بیان کیا جائے جیسا کہ ارجن نے شری کرشن بھگوان سے کیا تھا۔ البتہ ہر شخص کا شری کرشن بھگوان جیسا گرو نہیں ہوتا، مگر بیشتر لوگوں کا ایک ایسا

ساتھی ضرور ہوتا ہے جس پر انہیں بھروسہ ہوتا ہے اور اس کے مشورے کو وہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں علاوہ ازیں بڑی بات یہ کہ اس شخص پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ ایسے دوست سے مشورہ کرنے پر پورے مسئلہ کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور کسی نتیجے یا فیصلے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ کا کوئی گرو نہیں یا یہ کہ گرو مسائل کو حل نہیں کر پا رہے، ایسی صورت میں بقیہ اقدامات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے ذہن کو کام میں لانے کے سوا دوسرا چارہ نہیں جس سے کسی نتیجے پر پہنچا جاسکے۔

تیسرا اقدم یہ ہے کہ جو بھی صورت حال درپیش ہوں انھیں صحیح سمجھنے کے لیے جذبہ کے تحت پیدا ہونے والے تمام خیالات، شک و شبہات کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ سادہ لفظوں میں یہ بات یوں سمجھی جاسکتی ہے کہ آپ کا مسئلہ محض جذبہ کے تحت نفسانیت کے بڑھنے یا نفس کے زخمی ہونے کے سبب تو پیدا نہیں ہوا تھا۔ مستحکم نتائج حاصل کرنے کے لیے خواہشات کا تجزیہ ضروری ہے، تاکہ اس بات کا اطمینان کر لیا جائے کہ مسئلہ کے حل کا مقصد محض عزت نفس کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ فی الواقعی کوئی خاص مقصد حاصل کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کسی بات کو شعوری یا لاشعوری طور پر چاہتے ہوں وہ محض جذبہ کی تسکین ہو۔ ایسی صورت میں اس قدم کے سلسلے میں مجوزہ عمل ضروری نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات انسان شعوری طور پر اپنے جذبہ کی طمانیت اور تسکین کے متعلق فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اُس نوعیت کے انسانی عمل کی ایک عام مثال بدلہ یا انتقام ہے۔ جہاں ایک شخص اپنے زخمی جذبہ کی آسودگی کا متلاشی ہوتا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں متعلقہ شخص بدلہ کے جذبہ و احساس سے اس قدر مغلوب ہوتا ہے کہ وہ براہ راست عملی اقدام اٹھاتا ہے اور شاذ و نادر ہی کسی فیصلے پر پہنچنے کی کش مکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ شخص فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے، مثال کے طور پر اُسے یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ وہ بدلہ لینے کے لیے کیا طریقہ کار اپنائے، اس طرح کا سوچنا اور اس کا تجزیہ اُسے جذبہ کی تسکین کی خاطر کی جانے والی کوششوں کے نتائج کے بارے میں عقل سے قریب کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ذاتی انتقام کے اپنے ارادے سے باز آجائے۔ اگر وہ اتنا بھی نہیں سوچ پا رہا ہے جتنا کہ اوپر مذکور ہے تو پھر مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ ہم میں سے بہت سے لوگ اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں جذبہ کے تحت مغلوب ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے عمل کے سلسلے میں محرکات کا شعور نہیں ہوتا بلکہ اپنے حقیقی عمل کے سلسلے میں کچھ بلند بانگ، مقاصد منسوب کیے جاتے ہیں۔ ہمارا جذبہ اکثر انتہائی بے غرضانہ شکل میں کارفرما ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس قدم کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں ہی شری کرشن کو ارجن کی طرف سے اس بات کی اطلاع ملی کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے

ہیں تو انھوں نے سب سے پہلے ارجن کے جذبہ کو پاش پاش کیا۔ شری کرشن مہاراج نے ارجن سے کہا کہ کمزوری اور بزدلی کا شکار ہونا تمھیں زیب نہیں دیتا۔ اس تذبذب اور کمزوری کو دور کرو۔ بھگوت گیتا باب دوم "سانکھیہ یوگ" اشلوک نمبر (۳) میں اس منظر کا بیان ملتا ہے۔ اشلوک ملاحظہ کیجیے:

کٹھِن وقت میں ایسی کیوں بے دلی — نہ ہو آریاؤں میں یوں بے دلی
تُو ارجُن نہ بَن حیز نامرد و زار — نہیں تیرے شایان شان جی کی ہار
یہ کم ہمتّی چھوڑ، کر جی کڑا — عدو سوز ارجُن کھڑا ہو کھڑا[1]

اُنھوں نے دوبارہ ارجن سے کہا کہ "تم ایسی چیزوں کے لیے رنجیدہ ہو رہے ہو جن پر رنج کرنے کی ضرورت نہیں جبکہ تم عقل و دانش کے بلند و بالاالفاظ بھی ادا کر رہے ہو۔" بھگوت گیتا باب دوم "سانکھیہ یوگ" اشلوک نمبر۔(۲۴۔۲۵) میں اس منظر کا بیان ملتا ہے۔

جنھون پر نہین شوک کرنا روا — اُنھین پر تو ہے شوک کرتا بھلا
اور اسپر سمجھ کی باتین یہ سب — بنا اور بنا کر تو کہتا ہے اب[2]

بلاشبہ یہ ایک انتہائی مشکل عمل ہے خاص کر جبکہ فیصلہ کے متلاشی اُسے خود اپنائیں۔ فیصلہ نہ کرپانے کی حالت میں عمل کے متبادل راستوں کو پرکھتے وقت مضبوط قوت ارادی اور مسلسل کوششوں سے جذبہ کو ایک طرف رکھا جا سکتا ہے۔ فیصلہ پر نہ پہنچنے کی صورت پھر بھی باقی رہے یا یہ کہ عارضی طور پر فیصلہ کر لیا گیا ہو مگر اس وقت تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ جو راستہ اپنانے کی بات سوچی گئی ہے، وہ صحیح ہے یا غلط ایسی صورت میں گیتا کے فلسفے کے مطابق اگلا قدم یہ ہوگا کہ فیصلہ کرتے وقت اپنے ذاتی عمل یا کردار کی وضاحت کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ تعین کرنا کہ وہ کون ہے جسے فیصلہ کرنا ہے اور اس صورت حال میں آپ کی حیثیت کیا ہے جو فیصلہ کی متقاضی ہے اور یہ کس کا فرض ہے جس کا تعین کرنا ہے؟

تعین کے اس عمل کو دو مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے پہلا یہ کہ آپ سوال کریں گے۔ اس صورت

---

[1] دل کی گیتا، خواجہ دل محمد، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۴ء ص ۶۵

[2] شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ نظم، پنڈت رام پرشاد، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۰۶ء، ص ۸

حال میں عامل کی حیثیت سے آپ کا حقیقی رول کیا ہے؟ مثال کے طور پر آپ کو اس بات کی تشخیص کرنی ہے کہ جو مسائل آپ کے سامنے درپیش ہیں اس میں آپ کا رول ماں، باپ، استاد، سپاہی رہنما یا پھر کس کا ہے۔ دوسرے مرحلے میں یہ جانچنا ہے کہ متبادل طریق عمل میں سے کونسا طریقہ اس رول کو بہتر صورت میں نبھانے کے لیے موزوں ہے۔ فیصلہ پر نہ پہنچنے کے بہت سے حالات میں اصل دشواری یہ ہوتی ہے کہ متعلقہ شخص کو درپیش کام میں اپنے حقیقی رول کا علم نہیں ہوتا۔ ارجن اگر کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پار ہے تو اُن کے سامنے بھی درحقیقت یہی دشواری تھی۔ وہ ایسے فرد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے جس کے سامنے صرف یہ مسئلہ تھا وہ چند ایسے آدمیوں کو ہلاک کریں یا نہیں جو اتفاق سے اُن کے عزیز ہوتے ہیں۔ شری کرشن کا اصل کام ارجن کو یہی بتانا تھا اس صورت حال میں ارجن کا حقیقی رول سماجی طبقے کے رہنما کی حیثیت سے تھا۔ اُس سماج کی بنیاد ڈالنا تھا جو ناانصافی کا خاتمہ چاہتا تھا اور قانون کو ضبط تحریر میں لینے کا خواہش مند تھا۔ اُس نقطہ نظر سے ارجن کو محض خود کو اُن کا باپ، چچا، بھائی، دوست یا طالب علم تصور کرنا غلط تھا جو میدان جنگ میں اکٹھا ہوئے تھے۔ اُن کے منصب کا تقاضا یہی تھا کہ وہ جنگ کر کے برائی کے مرتکب کا خاتمہ کریں۔ اسی بنا پر انھوں نے لڑائی سے انکار کیا۔ ایسا کرنے سے وہ اپنے عزیز و اقربا کا خون بہائیں گے اور سماج میں ابتری لانے کے ذمہ دار ہوں گے، ایسا فیصلہ جو اُس وقت اپنے کردار کو نہ سمجھنے کے باعث ہوا۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی راستہ اپنا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شری کرشن نے ارجن کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ وہ بلند و بالا الفاظ اپنی زبان سے ادا کر رہے ہیں جبکہ وہ ایسی چیزوں کے لیے رنج کر رہے ہیں جن پر انھیں رنج نہیں کرنا چاہیے۔ درحقیقت اگر ارجن یہ چاہتے تھے کہ اُن کا فیصلہ حقیقی طور پر فلسفیانہ دلائل پر مبنی ہو، تو انھیں اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ اس مقصد کے لیے معقول پسندانہ تجزیہ درکار تھا۔ درپیش صورت حال میں تجزیہ کیے بغیر فیصلہ کرنا ہی ارجن کی غلطی تھی۔ بھگوت گیتا میں فرض کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کسی بھی صورت میں فرض کی ادائیگی کی اہمیت حسب ذیل اس حکم سے ظاہر ہوتی ہے جو شری کرشن نے ارجن کو دیے تھے۔ اپنے فرض کی ادائیگی خواہ اچھی طرح سے نہ کی گئی ہو دوسروں کے فرض کی ادائیگی سے خواہ وہ بہت بہتر طریقے سے کی گئی ہو، سے کہیں زیادہ افضل ہے۔ فرض کی ادائیگی کا بیان ہمیں بھگوت گیتا کے دوسرے باب ''علم کا فلسفہ'' اشلوک نمبر (۳۱) میں ملتا ہے۔ اشلوک ملاحظہ کیجیے:

فرض اپنا جان کر، لرزاں نہ ہو تم قطعی　　فرض سے ہٹنا، نہیں اس سے بڑا کوئی گنہ

ہو برائے حق لڑائی، قابلِ تحسین ہے جنگ سے انکار 'چھتری' کے لیے کار سیہ [۳]

اسی طرح فیصلہ پر پہنچنے کے طریق عمل کے پہلے چار اقدامات کا تعلق افراد کو اس بات کا اہل بنانے سے ہے کہ وہ صحیح فیصلے کر سکیں۔ اگلے چار اقدامات اس بات سے تعلق رکھتے ہیں کہ کسی مسئلے کے جس قدر ممکن حل پیشِ نظر ہوں، اُن میں سے صحیح حل کا انتخاب کیسے کیا جائے۔ پانچواں اقدام مسئلے کے ممکنہ حل کو صحت کی کسوٹی پر پرکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی مسئلے کے جس قدر حل ممکن ہوں انھیں سامنے رکھ لیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ منطقی اعتبار سے کون سا حل درست ہے۔ اس صورت حال تک پہنچنے کے لیے مطلوبہ صورت حال میں اپنے حقیقی رول کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ صورت حال میں مسئلے کے جس قدر متبادل حل ہیں اُن میں سے کون سا حل کردار سے مطابقت رکھتا ہے اور اُس رول کے لیے کیا فرائض متقاضی ہیں۔ کردار سے مطابقت نہ رکھنے والے طریقوں کو مسترد کر دینا چاہیے۔ اس طرح درجہ بہ درجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ تجزیے سے درپیش حالات میں انتہائی معقول راستہ نظر آجائے گا۔ کرشن نے ارجن کو منجملہ دیگر باتوں میں یہ بتایا کہ کسی بھی صورت حال میں مسئلے کے حل سے متعلق جس قدر متبادل راستے ہوں، اُن کا معقول، پسندانہ تجزیہ ضروری ہے اور اُس کے ساتھ ہی اپنے کردار اور مقصد کے لیے بھی یہ تجزیہ ضروری ہے۔ انھوں نے جنگ کرنے کی ضرورت کا یقین دلانے کے لیے ارجن کے سامنے مختلف دلائل پیش کئے تاکہ وہ بتائے گئے لائحہ عمل کے پس پردہ منطق کو سمجھ لیں۔ کرشن نے عمل کے متبادل راستے کے نشیب و فراز بھی واضح کئے یعنی یہ کہ اگر انھوں نے جنگ سے منھ موڑا تو اُس کے حسن و قبح کیا ہیں۔ تمام بحث کا مقصد یہ تھا کہ صحیح راستے کی پہچان ہو سکے۔ آج کے دور میں بھی فیصلے کے متلاشی کی ذات میں ارجن اور کرشن دو نمایندہ شخصیتیں ہیں اور یہ دونوں انسانی ذہن کو دو مخالف سمتوں میں کھینچتی ہیں۔ جب انسان کے ذہن میں اس طرح کی کش مکش ہو تو اس کے صحیح الدماغ ہونے کا پتہ چلتا ہے اور یہ اُس بات کا ثبوت ہے کہ ایسا ہونے پر متعلقہ شخص صحیح صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

چھٹا قدم مختلف عملی اقدامات کو جانچنے سے تعلق رکھتا ہے کہ کون سا راستہ قابل عمل ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ عملی امکانات اور پسندیدگی۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ عملی طور پر کون سا راستہ اپنایا جا

---

[۳] نغمۂ عرفان، ٹی۔ این۔ سریواستو، زرنگار باگڑبلی، مدن پورہ، وارانسی ۲۰۰۶ء، ص ۶۵

سکتا ہے اگر کئی راستے اپنائے جا سکتے ہوں تو پھر دیکھنا ہو گا کہ کون سا راستہ زیادہ ممکن اور قابل عمل ہے، دوسرے یہ کہ ہمارے سامنے جس قدر ممکن راستے ہوں، اخلاقی اعتبار سے کون سا راستہ زیادہ پسندیدہ ہے یعنی یہ کہ ہم کس راستے کو اخلاقاً صحیح یا اچھا مانتے ہیں۔ کرم یوگ کی وضاحت کرتے ہوئے کرشن نے پہلے یہ جانچا کہ ہمارے کرم کے لیے کون کون سے محرکات قابل عمل ہیں۔ اُس کے بعد انھوں نے اُن محرمات کو پرکھا، تاکہ پتہ چل جائے کہ اُن میں سے کون کون سے نہ صرف قابل عمل ہیں بلکہ پسندیدہ بھی ہیں۔ اس طرح ابتدا میں انھوں نے کہا کہ عمل یا کرم جسم کو متحرک رکھنے کے لیے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس میں ترمیم بھی کی کہ صرف وہی کام پسندیدہ ہیں جو ایثار و قربانی کا مظہر ہوں اور اُن کی انجام دہی سے دوسرے انسانوں اور جانداروں کا بھلا ہو۔ شری کرشن نے بات یہیں ختم نہیں کی، منطقی طرز استدلال سے وہ قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف وہی کام اخلاقی طور پر صحیح ہیں جو بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی کے لیے مفید ہوں۔ دوسرے الفاظ میں صرف وہی کام اچھے ہیں جو کائنات کے اخلاقی نظام کے تحفظ کے لیے اچھے ہوں۔ نظام کے تحفظ کے لیے ارجن کو فرض کی ادائیگی یعنی لڑائی لڑنی پڑی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا اچھائی کے بہت سے معیارات وضع کرتی ہے اور ہر معیار اپنی جگہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ لیکن کرشن نے بالآخر جس معیار کو پسند کیا، وہ سرچشمہ فطرت انسانی ہے اور جہاں سے دنیوی حقیقت کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

چھٹے قدم تک پہنچتے پہنچتے یعنی یہ کہ کسی فیصلے کے قابل عمل ہونے کو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھتے پرکھتے اس بات کا قوی امکان ہے کہ کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے ذہن آمادہ ہو جائے۔ بیشتر لوگ اس مرحلے کے بعد آزمائش کے لیے فکرمند نہ ہوں کیوں کہ یہ یقین کرنا عین منطقی ہے کہ بس اب قابل عمل اور پسندیدہ طریق عمل اپنا لیا جائے۔ لیکن بھگوت گیتا دو اور اقدام کے لیے کہتی ہے تاکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ سکے جو قدم اٹھایا جائے وہ عامل کے نزدیک وہ ہوں جس پر اُسے کامل اعتماد ہو قطع نظر یہ کہ اس کے ذریعے اُسے کامیابی ملتی ہے یا نہیں۔

ساتواں قدم یہ کہ فیصلہ پر پہنچنے کے لیے جو طریقۂ عمل اپنایا گیا ہے، وہ خود تشخیصی کے پیمانے پر بھی پورا اُترتا ہے یا نہیں۔ اس بات کا اطمینان کہ کیا یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان کی شخصیت باقی رہتی ہے یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں خود سے یہ سوال کرنا ہو گا کہ کیا مجوزہ عمل ایسا ہے کہ اس کے کرنے سے آپ اس راستہ پر قائم رہتے ہیں یا نہیں جو آپ نے مختص کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ

اس پر چل کر کسی حد تک عرفان ذات حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مجوزہ طریق عمل کے ساتھ خود کو پہچاننے کے اس طرح کے جذبے کی عدم موجودگی میں صورت حال کو سمجھنے اور اُس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے کردار اور پسند کئے ہوئے عمل کے تجزیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تحلیل نفس اور اپنی ذات میں جھانکنے کے عمل کے دوران ایک ایسا مرحلہ آنا لازمی ہے جب آپ کا مجوزہ فیصلہ آپ میں تعلق خاطر کا جذبہ پیدا کر دے اور آپ اس کے ساتھ مکمل اتفاق اور وابستگی محسوس کرنے لگیں۔ شری مد بھگوت گیتا میں یہ مرحلہ اُس وقت آیا جب شری کرشن نے بھکتی کے ذریعے ارجن کو صرف اُن کاموں کے ساتھ وابستگی اور اتفاق کا سبق دیا جو عالمی انسان کے لیے موزوں ہے۔ انسان خدا یا بھگوان کے مختصر روپ کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے ارد گرد کی حد بندیوں کو توڑے اور خود کو کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر دے۔ اُسے اپنے عمل سے بحیثیت مجموعی نوع انسانی کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔ اُسے محض اپنی ذات تک ہی مفادات کو محدود نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کی منزل پر پہنچنے کے بعد انسان نائب خدا کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے شری کرشن ارجن سے کہتے ہیں۔ میں تمام انسانوں میں برابر موجود ہوں مجھے نہ کسی سے نفرت ہے نہ محبت، جو عقیدت کے ساتھ میری پوجا کرتے ہیں وہ خود کو مجھ میں اور مجھے خود میں پاتے ہیں۔ سب سے زیادہ گناہگار، اگر عقیدت اور من سے میری عبادت کرے تو وہ پارسا آدمی ہے کیوں کہ وہ صحیح سمت میں گامزن ہے۔ وہ جلدی ہی پاکیزہ ہو جاتا ہے اور اُسے ابدی شانتی حاصل ہو جاتی ہے۔ ارجن میری بات یاد رکھو کہ میرا بھگت کبھی بھی تباہ نہیں ہوتا۔ متذکرہ مکالموں کا علم شری مد بھگوت گیتا کے نویں باب "پرم گوھیہ گیان عظیم پوشیدہ علم" اشلوک نمبر (۲۹-۳۰) میں ملتا ہے۔

سموھم سروہ، بہو تیشُو نہ مے دویش یوِ ستی نہ پر تیح
یہ بھجتی تُو مام بھکتیا مئی تے تیشُو چاپی اھم
اپی چیت سُو دور اچارو بھجتے مام اننیہ، بھاک
سادھور ایوسہ منتوتیح سمیگ ویو سیتو ہی سح
کشی پوم بھوَتِی دھرماتما شَشوَچ، چھا تیم نیگچ چھتی
کو تنتیہ پرتی جانیھی نہ مے بھکتح پرنَش یتی [۴]

لہٰذا اپنا دماغ مجھ پر مرکوز کرو میری پوجا کرو، ہر چیز میرے لیے قربان کرو، اپنا سر میرے آگے جھکاؤ اس

---

[۴] شریمد بھگود گیتا اصلی صورت میں، سوامی شریلہ پربھوپاد، بھگتی ویدانت بُک ٹرسٹ، ممبئی ۲۰۱۳ء، ص ۵۰۸-۵۱۲

طرح مجھ سے وابستگی پیدا کرکے اور میرے آگے پوری طرح جھکنے سے آپ مجھے پالیں گے۔ دسواں باب ”دربیان فروغِ جمال“ میں بھگوان شری کرشن کی عظمت اور ان کے صفات کا بیان ملتا ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ بھگوان، ایشور، اللہ تعالیٰ، خدا ایک ہی ہے اور وہ ہر شئے میں جلوہ نما ہے۔ باب دہم کے اشلوک نمبر (۹) کو ملاحظہ کیجیے:

جو عقید تمند مُجھ پر ہیں دلِ جان سے فدِا — جن کو دایم مشغلہ ہے میرے ذکر و فکر کا
دِل سے میری بندگی کرتے ہیں جو صبح و مسا — میں برائے وصل اُن کو علم کرتا ہوں عطا[۵]

آپ نے ازراہ عنایت جو انتہائی خفیہ علم مجھے دیا ہے اُس سے میرے شک وشبہات دور ہو گئے ہیں۔ ارجن کو اس باب میں بصارت اور بصیرت دونوں سے متعارف کرایا ہے کہ دنیا و مافیہا سب ایشور کا ظہور ہے۔ باب گیارہ ”ایشور کا ظہور“ اشلوک نمبر۔(۱) ملاحظہ کیجیے:

عرض کی ارجنؔ نے اے بندہ نواز — بے نواؤں بے کَسوں کے کار ساز
آپ نے اپنی نوازش سے مجھے — ساغرِ انوار بھر بھر کر دِیے
جسِ سے میں سرمست ہوں مسرور ہوں — اُلفتِ دُنیا کے دُوں سے دُور ہُوں
کیونکہ میں نے اے خدائے روح خیز — آپ کے لُطف و کرم سے بے گریز
سُن لیا خلق و فنا کا ذِکر سب — جُملہ مخلوقات کا اصلی سبب
آپ کا جو غیر فانی ہے اثَر — اُس سے بھی واقف ہوا ہوں سربسر[۶]

اگر صورت حال بہت زیادہ پیچیدہ نہیں ہے تو ہمیں اس حد تک جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف اس بات کو یقینی بنالینا کافی ہے کہ جو راستہ اپنایا جائے وہ ایسا ہو کہ ہمیں اس کی صحت کے بارے میں پورا یقین ہو۔

فیصلے پر پہنچنے کے سلسلے میں آٹھواں اور آخری قدم یہ ہے کہ خود کو اس طرح تصور کیا جائے گویا اپنائے گئے طریق عمل کے ذریعے آپ نے اپنا مقصد پالیا ہے۔ اس طرح آپ کے ذہن میں پہلے سے اس بات کا ایک جائزہ ہو گا کہ مقصد کے حصول کے بعد آپ کے جذبات اور تاثرات کیا ہوں گے اُس

---

[۵] مخزن اسرار، پنڈت دینا ناتھ مدن معجز دہلوی، لال حویلی۔ محلہ چوڑیگران، دہلی ۱۹۳۰ء، ص ۹۷

[۶] کلامِ ربّانی، پنڈت یوگی راج نظر سوہانوی، چندر گپت پریس دہلی ۱۹۳۴ء، ص ۷۷

تصوراتی عمل میں اپنی ذات کا ایک مکمل اور تفصیلی خاکہ پیش کرنے کے لیے ایک شعوری کوشش کرنی ہوگی۔ ایسا کرنے کے بعد اس خاکہ سے ذہنی طور پر نکلنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ باہر سے اس کی تصویر کیا ہے۔ حال کی بنیاد پر اپنے مستقبل کے بارے میں یہ ایک دلچسپ تصور ہے۔

آپ کو خود سے سوال کرنے ہیں، کیا اپنی اس تصویر میں آپ نے اپنے وجود کو پہچان لیا ہے۔ کیا یہ آپ کے اُس خیال سے مطابقت رکھتا ہے۔ جو در حقیقت آپ ہیں اور جو در حقیقت آپ کو ہونا ہے۔ کیا آپ کے بارے میں یہ تصویر آپ کے نزدیک قابل احترام اور قابل ستائش ہے۔ اور بالآخر یہ کہ کیا آپ اپنی اُس تصویر کو پیش کیے جانے کے حق میں ہیں اور اس کے ذریعے اپنی شخصیت دکھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ آپ کو بے حد پسند ہے اگر اُن سوالوں کے جوابات مثبت ہیں، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ صحیح فیصلے پر پہنچ گئے ہیں اس طرح کے طریق عمل کو اپنانے سے بالعموم کامیابی ملتی ہے۔ لیکن اگر کچھ ایسے عناصر، جو آپ کے قابو سے باہر ہیں، کامیابی نہیں ملتی، ان پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی آپ کو افسوس ہونا چاہیے کیوں کہ آپ نے اپنی طرف سے کوشش کی ہے۔

کام کے مقصد کے لیے اس طرح کے جائزے پر بہت زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ بھگوت گیتا نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ کرشن کی طرف سے دیے گئے تمام دلائل کے باوجود ارجن کو پوری طرح اس وقت تک یقین نہیں آیا جب تک کہ اُنھوں نے شری کرشن کی عالمگیر ہیئت (وراٹ روپ) نہیں دیکھ لی جو گیتا کے علم کے مطابق، اُن کا اپنا حقیقی وجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ارجن نے شری کرشن سے یہ کہہ دیا کہ اب جبکہ میرے شک وشبہات دور ہو گئے ہیں، آپ در حقیقت وہی ہیں جس کے ہونے کا آپ اعلان کرتے ہیں لیکن میں آپ کی عالمگیر ہیئت دیکھنا چاہتا ہوں۔ مثال باب گیارہ ''ظہور جلوہ کا فلسفہ'' (اشلوک نمبر/۳) میں اس کی وضاحت ملتی ہے۔

میری آنکھ ہے اور جلال آپ کا بسا میرے دل میں جمال آپ کا
یہ حسرت ہے دیکھوں میں روپ آپ کا سجالوں نظر میں سروپ آپ کا[۷]

کرشن کی عالمگیر ہیئت سے ارجن کو شری کرشن کی اس بات کا یقین آگیا کہ کائنات کے اوپر اُن کی حقیقت کارفرما ہے، وہ ایک ہے اور فرد اس عالمگیر حقیقت کا ایک پرتو ہے۔ اگرچہ ارجن ان کی عالمگیر ہیئت سے

---

[۷] اُردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم و عمل)، انور جلالپوری، نعمانی پرنٹنگ پریس، گولہ گنج، لکھنؤ ۲۰۱۳ء، ص ۲۲۳

حیران ہو گئے تھے، لیکن اُن کا یہ احساس حیرت، توصیف اور بھگتی کی دین تھا، نہ کہ خون کے رشتے کی دین۔ یہ جانتے ہوئے کہ اُن کا گرو (استاد) کون ہے، ارجن نے اپنے الفاظ پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ شری کرشن نے جو کچھ کہا ہے، اُس پر عمل کرنے سے، وہ اپنا حقیقی رول ادا کر رہے ہیں۔

اسی طرح بھگوت گیتا کی تعلیمات کے کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے انتہائی نادر عمل یا تکنیک اخذ کی جا سکتی ہے۔ عام آدمیوں کے لیے بھگوت گیتا ایک نادر تحفہ ہے جس سے وہ روز مرہ کی زندگی میں کام لے سکتے ہیں۔ جوں ہی کسی شخص نے اس عمل یا تکنیک کو اپنانے کی تربیت حاصل کرلی، اس کی مشق سے اُس کا ذہن کھل جائے گا اور اُس کی زندگی زیادہ معقول اور آرام طلب ہو جائے گی۔ بھگوت گیتا کے اس نظریے کے مطابق طریق عمل وہ ہے جو انسان کی عالمگیر فطرت کے مطابق ہو، دوسرے الفاظ میں جسے کہ ترکیب کہتا ہے، ہمیں ایک ایسا طریقہ اپنانا ہے جسے ہر شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنا سکے۔ تاہم یہ معیار فیصلہ کی صحت کو جانچنے کے دیگر معیارات سے باز رکھنے کی کوشش نہیں ہے۔ اس مرحلہ پر جو بات اہم ہے وہ یہ کہ فیصلے کے متلاشی کو اپنے عمل کی پسندیدگی کی جانچ راست بازی اور دیانتداری کے اُن معیارات پر کرنی چاہیے جنھیں وہ مانتا ہے۔

شری مد بھگوت گیتا کے اس مختصر جائزے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ گیتا کا متن صرف ایک مذہب سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حکمت و دانائی کسی ایک قوم تک محدود نہیں رہتی۔ خود اسلام میں واضح طور پر کہا گیا ہے۔ (حدیث) ''حکمت مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے وہ اُسے جہاں پائے وہ اس کا ہے۔'' شری مد بھگوت گیتا شدید کشمکش اور تذبذب کی حالت سے نکلنے اور بہترین طریقہ عمل منتخب کرنے میں ہماری مدد کرتی ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شری مد بھگوت گیتا کے اصول صرف سناتن دھرم کے ماننے والوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت آفاقی، ہمہ گیر ہے یہ ہمیں قوت فیصلہ بھی عطا کرتی اور رائے راست پر چلنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔

اخبار علمیہ

برطانیہ میں اسکول پرنسپل کے طور پر کام کرنے والا پہلا روبوٹ

برطانیہ کے مغربی ساسکس میں واقع نرسری کوٹسمور اسکول نے ایک ''روبوٹ'' کا تعارف کرایا ہے جو مصنوعی ذہانت کی ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے ہیڈ پرنسپل کے طور پر کام کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ جو روایتی انسانی ڈائریکٹر کے کام میں اس کی مدد کرتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے اور اس کا انتظام کرنے والا یہ پہلا اسکول ہے۔ اس روبوٹ سربراہ کا نام ابیگیل بیلی ہے۔ برطانوی اخبار ''ڈیلی ٹیلی گراف'' کی طرف سے شائع ہونے والی اور ''العربیہ نیٹ'' کی طرف سے جائزہ لینے والی ایک رپورٹ میں اسکول کے ڈائریکٹر ٹام راجرسن کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ''روبوٹ'' یا ''خودکار چیٹ پروگرام'' ان کی اور دیگر دو اساتذہ کی مدد کرے گا۔ یہ ایک ایسا نجی اسکول ہے جس میں ایسے مخلوط رہائشی اور روزآنہ آنے والے طلبہ کا داخلہ لیا جاتا ہے جن کی عمریں ۴ سے ۱۳ سال تک ہوتی ہیں۔ گھریلو برطانوی طلبہ کے لیے اس میں ۳۲ ہزار سالانہ برطانوی پاؤنڈ کا خرچ آتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق مذکورہ ''روبوٹ'' مشہور چیٹ اپیلی کیشن (Chat GPT) کی طرح کام کرتا ہے اور یہ ایک بڑا لسانی ماڈل ہے جسے ڈیٹا کے وسیع شعبوں پر تربیت دی گئی ہے جو انسانوں جیسے ملتے جلتے رد عمل کو ظاہر کر سکتا ہے۔ (الوطن اخبار، بحرین، ۱۸/ اکتوبر ۲۰۲۳، صفحہ ۲۰)۔

''مردوں کی کتاب'' نامی کتاب ملی

مصر میں ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کے دوران ۳۴۰۰ برس ایسی پرانی قبر کی دریافت کی ہے جس میں کئی ممیاں رکھی گئی ہیں۔ ماہرین اس وقت اور حیرت زدہ ہو گئے جب انہیں اس قبر میں ''مردوں کی کتاب'' نامی ایک قدیم صحیفہ ملا۔ ان کا خیال ہے کہ مردوں کو ممی کی شکل میں تدفین کے وقت اس کتاب سے کچھ پڑھا جاتا تھا۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ یہ قبر قدیم مصر کے کسی مخصوص اعلیٰ عہدیدار یا پجاری کی ہو سکتی ہے۔ یہ ۱۸ میٹر لمبی ''مردوں کی کتاب'' ۵۰ فٹ لمبے ایک گہرے گڈھے سے ملی اور اب بھی یہ کافی اچھی حالت میں ہے۔ یہ مصر میں پائے جانے والے قدیم درخت کی چھال سے بنے کاغذ سے بنی ہے اور مصر کی قدیم زبان میں ہے۔ ساتھ میں تصویریں بھی ہیں۔ (ہندی روزنامہ ہندوستان، وارانسی ۱۸/ اکتوبر ۲۰۲۳ء ص ۱۴)

ک، ص اصلاحی

تبصرہ کتب

مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی تبلیغی تحریک از مولانا محمد عبدالملک جامعی مدنی، مرتب جناب معصوم مرادآبادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۲۰۰، قیمت ۲۰۰ روپے، سال اشاعت ۲۰۲۲، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، جامع مسجد، دہلی اور نئی دہلی، علی گڑھ، احمد آباد، حیدرآباد، مرادآباد کے مشہور مکتبے۔ موبائل نمبر: ۹۸۱۰۷۸۰۵۶۳، ای میل:khabardaar@yahoo.com

تبلیغی جماعت اس کے بانی اور پھر اس کے نامور اشخاص کے متعلق اب بہت کچھ تحریری سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ جس سے جماعت اور اس کے کاموں یا کارناموں سے واقفیت بھی خوب ہو جاتی ہے، لیکن جماعت کے ابتدائی زمانہ کا اور حضرت مولانا الیاسؒ کی ایک الگ ہی شخصیت کا ذکر ان حضرات کی زبانی کچھ الگ ہی لطف رکھتا ہے جو مولانا کے بہت قریب اور جماعت کے زمانہ آغاز میں ان کے کاموں میں ہمہ تن شریک رہے۔

زیر نظر کتاب کوئی مرتب سوانح حیات نہیں، یہ جماعت کی تاریخ یا اس کے باقاعدہ تعارف کے لیے بھی کوئی تصنیف نہیں۔ اس میں مولانا الیاس اور تبلیغ کے لیے بس ان کی تڑپ اور محنت کی کچھ جھلکیاں ہیں، لکھنے والے مولانا کے ایسے عقیدت مند کہ تبلیغ کے لیے ساری زندگی وقف کر دی۔ ان قلب و ذہن کی وسعت و کشادگی اور زبان و خیال و اسلوب کی سادگی جتنے پیارے انداز میں ان کے قلم سے ظاہر ہوتی ہے اس میں لطف و لذت تو ہے، قاری کے لیے اس میں ایک سبق بھی ہے۔ موضوع شخصیت ہو یا دنیا و دین کا کوئی معاملہ ہو، خیال جمہور کے مطابق ہو یا پھر قابل بحث و نزاع، لہجے کا بھولا پن اس کو سننے کے لائق کیسے بتا دیتا ہے، اس کا نمونہ یہ کتاب ہے۔ کسی نے کہا کہ مولانا الیاس پر کچھ لکھ دیجیے، جامعی صاحب کا جواب انکار میں تھا اور اس خیال کی وجہ سے تھا کہ تحریک کو تحریر میں لانا گویا تحریک ختم کرنے کے مترادف ہے، لیکن یہ کہنا کہ یہ ایسی ہی ممانعت تھی جیسی حضور ﷺ نے کتابت حدیث کے بارے میں ضروری قرار دی تھی۔ ظاہر ہے مقام سخت ہے لیکن جذبہ کی گرمی نے ذہن کو بڑی آسانی سے اس مشکل سے گزار دیا، مولانا منظور نعمانی کی ایسی ہی فرمایش پر یہی بات یوں کہی کہ ''مولانا کچھ چیزوں کو تو بے لکھے چھوڑ دیجیے''۔ اس کے باوجود جامعی صاحب نے آنکھوں دیکھی کچھ باتیں قلم کے حوالے کر ہی دیں، یہ واقعی کام کی باتیں ہیں جیسے مولانا الیاسؒ نے غضب کی حالت میں فرمایا کہ ''مسلم پر اعتراض حرام ہے حرام۔ خیر کی توفیق اول تو کسی کو ملتی نہیں اگر مل گئی اور مسلم پر اعتراض کیا تو وہ توفیق بھی سلب کر لی جاتی ہے''۔ ایک جگہ بانی تبلیغ کی محبت نے انشاپردازی کے جوہر

دکھائے، لکھا کہ ''ہاں تو یہ مولانا کا طریق عام تھا وہ اسی طرح دلوں کو پگھلا پگھلا کر قصر جنت کے شیشے ڈھالتے اور آنسوؤں کی لڑی سے دل کے ہار تیار کرتے۔ یہ ان کی صنعت تھی، میں کہتا ہوں کہ وہ نادر الوجود انسانوں میں تھے یعنی جو صدیوں کے بعد ملا کرتے ہیں اور پھر صدیوں تک نہیں ملتے''۔ اس عقیدت کے باوجود ایک جگہ اپنے محسنوں کے شمار میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی کا نام لیا اور لکھا کہ ''مولانا الیاس کے پاس جو چیزیں ہم نے بعد میں پائیں وہ بہت ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ مودودی صاحب کے ہاں مل چکی تھیں''۔ شاید دل کی یہی وسعت تھی جس نے ان کو جامعی سے مدنی بنادیا، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی متنوع صفات شخصیات سے تعلق، تبلیغ کی بنیادی ضرورت کے لیے ان کے لیے مہمیز بن گیا۔ حق یہ ہے کہ جامعی تو بہت ہوئے، جامعیت کم ہی کے حصہ میں آئی (یہ بات دوسری نسبتوں کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے)۔ اسی خوبی نے شاید ان کو رسول اللہ ﷺ کے شہر کی سکونت کی نعمت عطا کردی۔ اچھا ہوا کہ ان کی کچھ کم یاب تحریروں اور بعض غیر مطبوعہ مضامین کو جمع کرنے کی سعادت فاضل مرتب کی قسمت میں آئی، وہ مولانا جامعی کے بھانجے ہیں، ان سے زیادہ اس سعادت کا حق اور کس کا ہوسکتا ہے۔

عمیر الصدیق ندوی

ذکر اقبال (مولانا محمد اقبال ملاندویؒ) مرتب، مولانا محمد ناصر سعید اکرمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، بہترین طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۴۴، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: معہد الامام حسن البنا، مدینہ کالونی، امین الدین روڈ پوسٹ بکس ۱۳ این کے ۵۸۱۳۲۰، بھٹکل، کرناٹک۔ سن اشاعت ۲۰۲۱ء موبائل ۹۹۰۲۱۵۳۰۰، ای میل hasanulbannainstitute@gmail.com اور مکتبہ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔ یوپی۔

صدیوں پہلے خدا جانے وہ کون سا وقت تھا کہ عرب تاجروں کا ایک سفینہ، ہند کے جنوب مغرب کے ایک ساحل سے آلگا اور یہ لگاؤ ایک بستی یا ساحلی پٹی سے ایسا مستحکم ہوا کہ آج تک بحر عرب کی موجیں اس تعلق کے آگے بچھی رہتی ہیں، اس پورے علاقہ کو شہرت بھٹکل کی بستی سے ملی، یہ تاجر صرف تجارت تک ہی محدود نہیں رہے، اسلامی اور عربی تہذیب و ثقافت سے بھی پورے خطہ کو مالا مال کرتے رہے، آج ہندوستان بلکہ بر صغیر کی چند وہ بستیاں شمار کی جائیں جہاں دین و دنیا کے علوم کی جامعیت، دینی معاشرت اور اردو تہذیب اور ادب و ثقافت کی خوبصورت تصویر نظر آتی ہو تو ان میں بھٹکل یقیناً نمایاں نظر آئے گا۔ اسی بھٹکل کی ایک نہایت قابل قدر دل کش بلکہ دل میں اتر جانے والی شخصیت ملا محمد اقبال مرحوم کی تھی، بھٹکل کی صدیوں کی تاریخ جیسے ان کی شخصیت کا عنوان بن گئی، علم

و عمل اور اخلاص وایثار اور خاموشی ودل سوزی کا وہ جیتا جاگتا مرقع تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نفع ونقصان کا حساب رکھنے والی بھٹکل قوم نے ان کو اپنی ہر ضرورت کا ذمہ دار بنالیا۔ جماعت المسلمین، جامعہ اسلامیہ، تحفیظ القرآن، بین الجماعتی کمیٹی، مجمع العلماء دارالافتاء، دارالقضاء، مجلس امور شرعیہ گویا ہر ادارہ کی سرپرستی ان کے سپرد کردی گئی۔ اور کمال یہ ہے کہ انہوں نے ہر ذمہ داری کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، اس طرح ان کی زندگی خدمت اور محبت کے دو لفظوں یا شرف انسانی کی علامتوں کی داستان بن گئی، ان کے بارے میں کہا گیا کہ وہ علامہ اقبال کے مومن منتظر اور اور خود اقبال دکن تھے۔ یقیناً ان کی مجموعہ صفات شخصیت کا مطالعہ ضروری تھا اس کے لیے فاضل مرتب نے بڑی محنت اور مستقل مزاجی سے سینکڑوں مضامین لکھوائے اور نہایت سلیقہ سے ان کو مرتب کر کے ذکر اقبال کے نام سے قوم کے سامنے ایک نمونہ عمل پیش کردیا، یقیناً ایسے مجموعہ سوانح کے لیے فخریہ کہا جاسکتا ہے کہ "ہٰذا ذکر"۔ ع۔ ص

ہندوستان میں مطالعۂ قرآن مجید معاصر منظر نامہ (۲۰۲۰ء): مرتبہ ڈاکٹر محمد مبین ندوی ازہری۔ کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۴۰، ملنے کا پتہ: خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت: درج نہیں۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۹۸۱۸۸۹۷۹۷۵۔ ای میل: bbpublication@gmail.com

خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن علی گڑھ نے ۴-۵ مارچ ۲۰۲۰ء کو ایک سیمینار "ہندوستانی اداروں میں مطالعات قرآن کا منظر نامہ" کے موضوع پر منعقد کیا تھا۔ زیر نظر کتاب اسی سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل ۲۶ مقالات ہیں۔ اعظم گڑھ، بنارس، دہلی، دیوبند، علی گڑھ، کلکتہ کے دینی اداروں اور یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی، اہل حدیث اور بعض دوسرے فضلا کی قرآنی خدمات کا الگ سے بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر حمید اللہ مرازی کا مقالہ قرآنک اسٹڈیز ان کشمیر انگریزی اور مظاہر علوم، جامعہ اسلامیہ شانتاپرم کیرالا اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی قرآنی خدمات کا جائزہ عربی میں ہے۔ ندوۃ العلما، دارالمصنفین اور ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کی قرآنی خدمات کا تذکرہ اس مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ جس سے ایک خلا محسوس ہوتا ہے۔

پیش لفظ کے مطابق ادارہ نے قرآنیات کے اہم اور حالات کے متقاضی موضوعات ومسائل پر ۲۰۱۲ء سے اب تک دو درجن اردو اور ایک درجن انگریزی میں کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ ادارہ کے فعال ڈائریکٹر اور ان کے رفقائے کار کا کارنامہ ہی کہا جائے گا۔ زیر نظر موضوع بھی اہم اور ضرورت

کے مطابق ہے۔کلیدی خطبہ میں دکھایا گیا ہے کہ عہد نبویؐ میں قرآنی تعلیمات کی جو کرن پھوٹی وہ ہندوستان تک کیسے اور کن ذرائع سے پہنچی اور اس خطہ میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں اس کے فروغ و اشاعت کی کیا صورت حال رہی ۔ بعض ضروری پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔قریب قریب تمام مقالات محنت اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔البتہ بعض مقالات میں غیر ضروری اطناب اور بعض میں ایسا اختصار ہے کہ تشنگی باقی ہے۔ کلیم صفات اصلاحی

عنایت نامے مشاہیر کے خطوط: ترتیب و تحشیہ: پروفیسر مقصود احمد، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش ۔ صفحات: ۴۴۲۔ ملنے کا پتہ: ۲۰۳ شفا کمپلیکس ٹنڈلجا روڈ ، بڑودہ گجرات۔ قیمت: ۴۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۹۸۲۴۰۳۳۷۱۰۔

کتاب کے مرتب مشہور و معروف مصنف ہیں۔اردو اور انگریزی میں متعدد موضوعات پر تقریباً بیس کتابیں لکھی ہیں۔اردو میں کتب سابقہ میں سید المرسلین سے متعلق بشارتیں، علم حدیث کے فروغ میں علمائے گجرات کا حصہ اور احوال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مقالات صدیقی (جلد اول) کا مفصل جائزہ نے اہل علم کی توجہ حاصل کی اور علمی حلقوں میں اس کی پذیرائی بھی ہوئی۔

زیر نظر تالیف مرتب کے نام ۱۹۷۲ء سے ۲۰۱۷ء تک لکھے گئے ۹۷ مشاہیر اہل علم کے ۲۹۸ خطوط پر مشتمل ہے۔اس کو الف بائی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔مکتوبات کے عدد مختلف ہیں۔پروفیسر مختار الدین احمد، سابق ناظم دارالمصنفین مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کے نام ۲۲، ۲۲ اور پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کے نام ۱۸، ۱۸ عنایت نامے ہیں۔احمد محمد عبدالرحمن، مولانا سعید الرحمن الاعظمی اور قاسم بن غلام انغار کا ایک ایک خط عربی اور ڈاکٹر فلپ سی سیڈ گروو اور ڈاکٹر حمید اللہ کے خط انگریزی میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہیں۔حرف آغاز میں مرتب نے ایجاز سے مکتوب نگاری کی ابتدائی تاریخ اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا اور ان کی حفاظت پر روشنی ڈالی ہے۔عہد نبوی و خلافت راشدہ کے مکاتیب کی اشاعت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ گرچہ قدیم ہندوستان میں مکتوب نگاری کا سراغ ملتا ہے لیکن مرتب کے بیان کے مطابق اس کی خاطر خواہ ترقی مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوئی۔اردو میں مکتوب نگاری کی ابتدا کا زمانہ ۱۸۲۲ء بتایا گیا۔ خطوط کے زمانۂ جمع و ترتیب پر مختصر اروشنی ڈالی گئی ہے۔زیادہ تر خطوط علمی وادبی نوعیت کے ہیں۔کہیں علمی وادبی مسئلہ پر استفسار ہے۔ کسی میں اپنی تصانیف اور مقالات کے متعلق رائیں ہیں۔نمایاں شخصیات کی تاریخ ولادت و وفات اور خط کے متون پر حواشی وغیرہ کا خاص اہتمام بھی کیا

گیاہے۔ خطوط اہل علم کے ہیں، اس لیے اس سے ماضی قریب کی مشہور علمی شخصیتوں کا خاکہ مرتب کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ ک ص اصلاحی

صبیح رحمانی کی نعتیہ شاعری (فکری و تنقیدی تناظر): مرتبہ: ڈاکٹر شمع افروز، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۶۰۰۔ ملنے کا پتہ: ۲۰۲۳ نعت ریسرچ سینٹر، انڈیا، محلہ بنجاریہ، ویسٹ خلیل آباد، سنت کبیر نگر یوپی۔ قیمت: ۱۰۰۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۹۴۱۵۷۸۵۷۶۱، ایمیل: drsiraj123@gmail.com

اردو کے نعت گو شعرا میں صبیح رحمانی کا نام اس لحاظ سے نمایاں ہے کہ انھوں نے اس صنف کے فروغ و اشاعت کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی تصانیف اور مجموعہ ہائے کلام سے قطع نظر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی کا قیام اور ''نعت رنگ'' کا اجرا ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ نعت گوئی کے موضوع پر سینٹر سے اب تک ۷۱ کتابیں شائع کی جاچکی ہیں جو اپنے آپ میں خود ایک کارنامہ ہے۔ نعتیہ شاعری میں تنقیدی رجحانات کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ غالباً ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی نعت گو کے نعتیہ کلام کا اس قدر تفصیل سے ناقدانہ جائزہ مختلف الحیثیات اہل قلم نے لیا ہو۔ ان مضامین میں جمالیاتی، تاثراتی، نفسیاتی، ساختیاتی اور اسلوبیاتی تمام پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور نقد نعت کے متنوع اسالیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ مضامین علاحدہ علاحدہ بھی اہم اور وقیع تھے۔ اب ایک مجموعہ میں شامل ہو کر مزید مفید ہو گئے ہیں۔ صبیح رحمانی کی نعت گوئی پر شمس الرحمن فاروقی کی یہ سند کافی ہے کہ ''صبیح کے یہاں سب سے بڑی بات مجھے یہ نظر آئی کہ انہیں رسول پاکؐ سے سچی محبت ہے اور وہ اس محبت کو اپنے شعر میں متشکل کر سکتے ہیں۔ پیش پاافتادہ مضامین سے انہیں پرہیز ہے اور عبارت آرائی سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ نعت گوئی کے تقاضے سے وہ واقف ہیں اور وہ اپنی بات میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کے بجائے محبت کی نرم حدت پیدا کرتے ہیں۔'' (ص ۲۷-۲۸)

کتاب کی مرتب ڈاکٹر شمع افروز کراچی یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ تنقید اور ادبی موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کر چکی ہیں۔ نعتیہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب چند خوشگوار رجحانات کو بڑی خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب قدر کے لائق ہے۔

ک ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

ہندوستان کے چند قدیم، معروف و مستند اور علمی وادبی موقر جریدوں میں سے ایک ''معارف''اعظم گڑھ بھی ہے جو عرصہ قدیم سے ملک وبیرون ملک کے دانشوران علم و فن کے مضامین کو شامل اشاعت کر کے علمی و دینی خدمت انجام دے رہا ہے۔ان مضامین کی ستائش علمی حلقوں میں بیشتر ہوتی رہتی ہے۔ ویسے تو احقر بھی ''معارف'' سے گذشتہ تیس سالوں سے بحیثیت قاری و مضمون نگار وابستہ ہے۔ خالی اوقات میں اس رسالہ کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اسی دوران ماہ اکتوبر۲۰۲۳ء کا حالیہ شمارہ بھی نظر سے گذرا، اس کے سارے مضامین الحمدللہ قابل قراءت، وقیع اور داد و تحسین کے قابل ہیں، مگران میں ایک مضمون جو مجھے چند سطور بشکل مراسلہ لکھنے پر مجبور کیا وہ ہے عالیہ یونیورسٹی کلکتہ کے شعبہ دینیات کے سابق صدر اور معروف اسکالر و محقق جناب ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی صاحب کا مضمون بعنوان ''ہندوستان اتنا ہی مسلمانوں کا ملک ہے جتنا کہ برادران وطن کا'' ایسا لگتا ہے کہ یہ مضمون حالات حاضرہ کے مزاج اور تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے۔اس میں تاریخ کی روشنی میں عرب وہند کے تعلقات پر خاطر خواہ گفتگو کی گئی ہے اور مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں مسلمان قدیم زمانہ سے آباد ہیں اور وہ یہاں کسی کے رحم وکرم پر نہیں ہیں۔ صاحب مضمون نے جس خوبصورت انداز میں تحریر میں شگفتگی پیدا کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

قمرالدین قمر علیگ
لائبریرین خواجہ بندہ نواز یونیورسٹی، گلبرگہ شریف، کرناٹک
qamruddinqasmi8@gmail.com

اردو

محترم ڈاکٹر صاحب، آپ نے جو اردو کا نوحہ لکھا ہے، وہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ ایک گھٹی آہ ہے، مگر فغاں کا اظہار باقی ہے۔ براہ کرم اس موضوع پر قدرے تفصیل سے بیان تحریر فرمایئے۔ یہ اردو کی شہادت کا المیہ صرف ہند اور کشمیر ہی میں نہیں رونما ہورہا ہے بلکہ خود پاکستان میں بھی اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے نام نہاد انگریزی میڈیم اسکولوں کا ٹڈی دل امڈا چلا آرہا ہے۔

سلیم منصور خالد
مدیر ترجمان القرآن لاہور
123ubm@gmail.com

رسید کتب موصولہ

اخی العزیز (عربی): مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی، مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، صفحات ۵۳۶، سال اشاعت ۲۰۲۳، قیمت ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

ایک فنکشن نگار کا سفر: مرتب اُدین واجپئی، مترجم: رضوان الدین فاروقی، اثبات پبلی کیشنز تھانے مہاراشٹرا، صفحات ۱۳۶، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۳۲۲۴۷۸۳۳

تذکرہ اصحاب بدرؓ: محمد امین حسنی ندوی، مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ، صفحات ۲۰۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۱۶۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۹۳۳۱۲۹۵

حسینہ منزل (ناول): ڈاکٹر اوشا کرن خان، مترجم: ضیاء فاروقی، کوہِ فضا، بھوپال، صفحات ۱۲۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۶۸۵۹۷۲۲۴۲

خالد محمود شخصیت اور ادبی خدمات: مرتبین، سیفی سرونجی، استوتی اگروال، زم زم بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور، صفحات: ۵۲۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۵۸۳۸۰۴۳۱

خاموش ہلچل (ہندی): ڈاکٹر مشتاق احمد عکس، کوشامبی، روڈ جھلوا، پریاگ راج، صفحات ۱۰۴، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۱۸۷۹۳۷۷۳۱

دعوتِ اسلامی، مسائل اور تقاضے: مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی، مرتب: محمد وثیق ندوی، الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ، صفحات ۲۲۴، سال اشاعت ۲۰۱۹ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۴۵۲۲۹۴۰۹۷

عکس تحریر (جدید تعلیمی و معاشی مسائل کا تجزیہ): پروفیسر محمد خالد، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات ۲۸۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۷۹۰۶۸۶۳۴۶۱

علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی کا اردو ترجمہ قرآن (ایک تجزیاتی و تنقیدی جائزہ): زریاب احمد فلاحی، براؤن بکس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات ۱۹۶، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۷۹۰۶۸۶۳۴۶۱

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اپنے فکر و عمل کے آئینہ میں: مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی، مرتب: محمد وثیق ندوی، مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، صفحات ۱۷۲، سال اشاعت ۲۰۱۸ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۷۹۳۱۱۸۲۳۴

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس ودبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم ومصر وشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	350/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print NOV 2023 Vol. 210/11

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	" "	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	" "	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	" "	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	560/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	" "	500/-
تاریخ اندلس (۴ جلدیں)	سید ریاست علی ندویؒ	1200/-
مصادر سیرت نبوی	کلیم صفات اصلاحی	600/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	550/-